کونسل کی سرگرمیاں

دہلی کے لیفٹی ننٹ گورنر جناب نجیب جنگ نے ۲۹/اپریل ۲۰۱۴ءکو نئی دہلی میونسپل کونسل کی جانب سے منعقد نئی دہلی کے صد سالہ تاریخ پر ایک نمائش کا رفیع مارگ واقع ....گیلری میں افتتاح کیا۔ اس موقعے پر دہلی حکومت کے چیف سکریٹری جناب ایس۔ کے۔ شریواستو، کونسل کے صدر عالیجناب جلیج شریواستو اور کونسل کے اعلیٰ افسران وغیرہ موجود تھے۔ اس موقعے پر جناب نجیب جنگ نے نمائش میں شامل پینٹنگس، مجسموں، فن پاروں، خط کشی اور تصاویر کا معائینہ کیا۔ دہلی کے لیفٹی ننٹ گورنر نے میونسپل کونسل کی جانب سے منعقد کرائی گئی مقابلہ جاتی پروگرام کے ۱۵/فنکاروں کو انعام سے بھی نوازا۔ اس تقریب میں کونسل کے صدر جلیج شریواستو نے بتایا کہ اس طرح کے کلچرل پروگرام کونسل کے تقریبِ صدی کے تئیں رواں سال کے دسمبر ماہ تک جاری رہیں گے۔ یہ نمائش ۲/مئی ۲۰۱۴ءتک عوام کے لیے کھلی رہی۔

این ڈی ایم سی کے سو سال مکمل ہونے کے موقع پر کونسل کے شعبۂ تعلیم کے ذریعہ ۲۹/اپریل اور ۳۰/اپریل ۲۰۱۴ءکو تال کٹورا اسٹیڈیم میں رقص و موسیقی کے جشن کا انعقاد کیا گیا۔ کونسل کے سکریٹری جناب وِکاس آنند نے میونسپل کونسل کے اسکولوں کے طلبا کے ذریعہ منعقد دو روزہ رقص و سرود کے جشن کا افتتاح کیا گیا۔ اس موقع پر کتھک کی مشہور و معروف رقاصہ محترمہ شوبھنا نارائن نے اس جشنِ عام کی صدارت کی۔ اس موقع پر میونسپل کونسل کے مختلف اسکولوں کے طلبا نے نو بہ نو انداز میں اپنے رقص پیش کیے۔ اس رقص و سرود کے جشن کا خوبصورت انجام میونسپل کونسل کے نَو یُگ اسکولوں کے ۲۰۰/طلبا کے ذریعہ ''آوازِ طفلی'' نامی ایک موسیقی کے پروگرام کے ساتھ ہوا۔ اس موقع پر محترمہ وِدوشی چترویدی ڈائرکٹر شعبۂ تعلیم کے علاوہ کونسل کے دیگر افسران بھی موجود تھے۔

کونسل کی سرگرمیاں

نئی دہلی میونسپل کونسل کے افسران اور کارکنان نے ۲۳/اپریل ۲۰۱۴ء کو کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو کی رہنمائی میں سابق کونسل کے صدر مرحوم محترم امتیاز خان کو ان کی سولھویں برسی پر محترم خان کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھا کر خراجِ عقیدت پیش کی۔ کونسل کے نائب صدر محترمہ تاجدار بابر اور میونسپل کونسل کے اعلیٰ افسران نے بھی مزار پر پھول چڑھائے۔ اس موقع پر میونسپل کونسل کے صدر، اراکین اور افسران نے مزار پر موجود مدرسہ کے بچوں میں خوردنی اشیا تقسیم کیے۔

ذہین اور تلاشِ استعداد، اسکالر شِپ انعامی تقریب کا افتتاح ۲۵/اپریل ۲۰۱۴ء تال کٹورا اسٹیڈیم میں کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو کی جانب سے کیا گیا۔ اس تقریب کے مہمانِ خصوصی عالیجناب جلج شریواستو کا خیر مقدم شعبۂ تعلیم کی ڈائرکٹر محترمہ وِدوشی چترویدی نے کیا۔ اس موقعے پر نئی دہلی میونسپل کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو نے حاضرین کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس تقریب میں ذہین طلبا کے ساتھ ساتھ محترمہ راما شرما (پرنسپل) اور محترمہ سمی سچدیوا کو بھی اعزاز سے نوازا گیا۔ اس میں کلچرل پروگرام کے ساتھ ساتھ اُردو اسکِٹ بھی پیش کیا گیا۔

کونسل کی سرگرمیاں

نئی دہلی میونسپل کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو نے ۲۰/مارچ ۲۰۱۴ء کو مشرقی قدوائی نگر میں پورٹا کیبن میں قائم کیے گئے ایک میونسپل پرائمری اسکول کا افتتاح کیا۔مشرقی قدوائی نگر کے اس میونسپل پرائمری اسکول کی عمارت ''ایسٹ قدوائی نگر پُنر وِکاس یوجنا'' کے ماتحت آنے کی وجہ سے پورٹا کیبن میں بنائے گئے اسکول میں دوبارہ قائم کیا گیا ہے۔اس پرائمری اسکول کا کل رقبہ 9534 مربع فٹ ہے۔اس اسکول میں 14 کمرے ،برامدہ اور بیت الخلا وغیرہ بنائے گئے ہیں۔اس اسکول کو پورٹا کیبن میں بنانے پر کل پچاس لاکھ روپئے صرف ہوئے ہیں۔

نئی دہلی میونسپل کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو نے ۲۷/مارچ ۲۰۱۴ء کو نگر پالیکا بال وَرِشٹھ وِدّیالیہ ،مندر مارگ کے وراثتی بھون کا ایک سادہ تقریب میں ترقی پذیر اور احیاء کے بعد افتتاح کیا۔نگر پالیکا بال وَرِشٹھ مادھیمِک وِدّیالیہ کے ترقی پذیر اور احیا ء پر 8.36 کروڑ روپئے کی لاگت آئی ہے اور یہ ۲۲/ماہ کے عرصے میں تکمیل کو پہنچا ہے۔

کونسل کی سرگرمیاں

نئی دہلی میونسپل کونسل کے صدر عالی جناب جلج شریواستو نے ۳؍ مارچ ۲۰۱۴ء کو میونسپل کونسل کے سنگاپور سفارت خانہ کے پارک میں ہوئی دوروزہ سوم بین شعبہ جاتی پھولوں کی نمائش اور مقابلہ کے فاتحین کو ۲۷؍ٹرافی اور ۴۴؍کپ دے کر انعامات سے نوازا۔ اس نمائش اور مقابلے میں میونسپل کونسل محکمۂ باغبانی کے چھ ڈویژن، جنوبی دہلی میونسپل کارپوریشن کے جنوب اور مرکزی زون نے بھی حصہ لیا۔ میونسپل کونسل کے محکمۂ باغبانی کے ذریعہ پھولوں کی نمائش اور مقابلے کا انعقاد تیسری بار ہوا ہے۔

نئی دہلی میونسپل کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو نے ۱۵؍اپریل ۲۰۱۴ء کو لکشمی بائی نگر میں آئی این اے میٹرو اسٹیشن کے نزدیک تین جدید پارکوں کا افتتاح کیا۔ یہ پارک میونسپل کونسل کے محکمۂ باغبانی کے ذریعہ 7000 مربع میٹر رقبہ میں بنائے گئے ہیں۔ ان میں ایک ''گلستانِ گلاب'' بنایا گیا ہے جس کو تین ہزار انواع واقسام کے گلاب کے پودوں اور بیل دار درختوں سے مزین کیا گیا ہے۔ اس میں ایک بینت کا پارک بھی بنایا گیا ہے۔ اس میں مختلف قسم کے پینتیس سو وبینت کے پیڑ لگائے گئے ہیں۔ ایک خوشبودار پودوں کا پارک بھی بنایا گیا ہے جس میں مختلف نسلوں کے چار ہزار خوشبودار پودوں کو لگایا گیا ہے۔ یہ پارک میونسپل کونسل کے محکمۂ باغبانی کے ذریعہ تین ماہ کے معینہ مدت میں ترقی دیے گئے ہیں۔ اس پارک سے آئی این اے کالونی اور لکشمی بائی نگر کے مقامی باشندوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ ہوگا۔

آپ کے خطوط

باسمہٖ تعالیٰ

محترمی! آداب ونیاز

نئی دہلی میونسپل کونسل کا عملی آئینہ ''پالیکا سماچار'' جلد (۱۔۲/ ۳۷) جنوری تا فروری ۲۰۱۴ء موصول ہوا۔ حسینی صاحب کے بعد آپ نے اس سماچار کو جن خوبیوں سے آراستہ وپیراستہ کیا وہ قابلِ تحسین ہے۔ شمارہ کے اول تا آخر تمام مضامین قابلِ مطالعہ ہیں اور اغلاط سے پاک وصاف ہیں۔ سرورق تو بہت ہی دیدہ زیب ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اس سے بہتر رسالہ شائع کریں گے۔

فی الوقت اپنی کچھ مختصر کہانیاں روانہ کر رہا ہوں۔ شائع کرنے کی زحمت کریں۔ اشاعتی شمارے کے ساتھ اپنی مفید رائے کا اظہار کریں، ممنون رہوں گا۔

(بسم اللہ عدیم، برہانپور)

○■○

☆

۲۸/ مارچ ۲۰۱۴ء

محترمہ انیس فاطمہ صاحبہ؛ تسلیم بصد تعظیم

امید ہے کہ آنجنابہ کے مزاج گرامی بخیر وخوبی ہوں گے۔ واضح باد کہ ''پالیکا سماچار'' کے تازہ شمارے میں آپ نے خاکسار کا انشائیہ ''عہدِ پیری خضاب کی باتیں'' شائع فرمایا۔ شکریہ! کہ آپ نے ازراہِ ادب احسان فرمایا۔ حوصلہ افزائی پاکر ایک اور انشائیہ ''مولانا راکٹ'' ارسالِ خدمت ہے۔ یقین ہے کہ اسے بھی پذیرائی کا درجہ دیں گی۔ زیادہ حد ادب خیر طلب....

خاکسار وقلم بردار

(مختار ٹونکی) ٹونک، راجستھان

○■○

عزیز محترم

ایس ایچ ایم حسینی صاحب؛ سلام مسنون

عیدالفطر کی دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

''پالیکا سماچار'' نئی دہلی کا نیا شمارہ مئی/ جون ۲۰۱۳ء دو روز قبل ہی موصول ہوا شکریہ؛ پالیکا سماچار کے اس نئے لُک اور گیٹ اَپ نے نہ صرف مسرت سے سرشار کیا بلکہ چونکا بھی دیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد پالیکا سماچار ایک نئے اور انوکھے انداز میں سامنے آیا ہے جو آپ کے شایانِ شان ہے۔ اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ اس نئے گیٹ اَپ کیلیے میں آپ تمام حضرات کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آ نے اِسے دوماہی کیا یہ زیادہ مناسب ہے۔ اب بغیر کسی تاخیر کے ممکن ہے رسالہ مارکیٹ میں آجایا کرے گا اور تعطل کا شکار نہیں ہوگا۔ اپنی دو خوبصورت غزلیں پالیکا سماچار کے قریبی شمارے کے لیے روانہ کر رہا ہوں امید کہ ہمیشہ کی طرح پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ والسلام

مخلص؛

(ڈاکٹر ایم آئی ساجد، کھام گاؤں)

مدیرِ محترم وِکاس آنند صاحب....آداب!

''پالیکا سماچار'' اردو کا جنوری/فروری ۲۰۱۴ء کا شمارہ موصول ہوا۔ تمام مشمولات بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کے حسنِ ترتیب وانتخاب کی داد دیتا ہوں۔ نئی دہلی میونسپل کونسل کی جانب سے اردو زبان وادب کا یہ خوبصورت اور دیدہ زیب مجلّہ اردو زبان اور اپنی تہذیب وثقافت مضبوط بنیادوں کا اعتراف کرنا ہے اور اس کے لیے مجلّہ کے سرپرست جلج شریواستو صاحب اور آپ کے تمام اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میں دو غزلیں ارسال کر رہا ہوں یقین ہے آپ کو پسند آئیں گی۔

(ڈاکٹر ذکی طارق، غازی آباد)

غزل

مدہوش بلگرامی

اشکِ خوں ہی جب زباں ہو جائے گا
میرا غم اس پر عیاں ہو جائے گا

دل میں ہو گر شوقِ تعمیرِ چمن
تنکا تنکا آشیاں ہو جائے گا

منجمد ہے فکر کا دریا ابھی
دھوپ نکلے گی رواں ہو جائے گا

دیکھ لینا میرا ہی طرزِ فغاں
لب کا اندازِ بیاں ہو جائے گا

ٹوٹ ہی جائے گا یہ تارِ نفس
جب حسابِ دوستاں ہو جائے گا

جب بدن جلنے لگے گا دھوپ سے
اس کا آنچل سائباں ہو جائے گا

کس لیے مدہوشؔ ہو نغمہ سرا
دشمنِ جاں باغباں ہو جائے گا

○■○

224۔ بہر اسوداگر مشرقی، ہردوئی، 241001

موجود ہے۔ غالبؔ کی مکتوب نگاری کا آغاز ۱۸۴۸ء کے آس پاس ہوا یہ وہ زمانہ تھا جب اردو نثر اپنے ارتقائی سفر کی بعض منزلوں سے گزر رہی تھی اور اپنے روشن مستقبل کی جانب تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ جب غالبؔ نے اردو مکتوب نگاری کی طرف توجہ کی اس وقت تک اردو نثر کے لیے نہایت حوصلہ افزا حالات پیدا ہو چکے تھے۔ مکتوب نگاری کے لیے فارسی سے اپنے غیر معمولی شغف کے باوجود غالبؔ اردو کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے اردو خطوط نگاری کے اصول وضع کیے۔ صحیح معنوں میں خطوط میں نئی ایجاد کا سہرا غالبؔ کے سَر ہے۔ غالبؔ کے وقت تک اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کی خط و کتابت کا انداز یہ تھا کہ لمبے لمبے القاب و آداب تشبیہوں اور کنایوں کے پردے میں چار باتیں ملتی تھیں۔ غالبؔ نے مراسلت کی اس روش کو ''محمد شاہی روِش'' کا نام دیا ہے۔ اردو خطوط میں القاب لکھنے کا غالبؔ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مخاطب کی حیثیت کے مطابق چھوٹا سا القاب لکھ کر مطلب کی بات بیان کر دیتے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد بہت کم ہیں جن میں القاب نہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لیے کاغذ قلم اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہوں اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کرتا ہوں۔ القاب و آداب کا پُرانا طریقہ شکر و شکوہ، شادی و غم کا قدیم رویہّ میں نے بالکل اٹھا دیا ہے۔'' بنام: شفق، خطوطِ غالبؔ، مہر ص: ۳۵۴

غالبؔ کے اکثر خطوط میں قربت اور اپنائیت کی فضا اور روبرو گفتگو کا انداز نمایاں ہے۔ کہیں خبریں سُنا کر، افسانوی رنگ اختیار کر کے اور کبھی کبھی مکالمے کا طرز اپنا کر باتیں کرنے کا انداز پیدا کرتے ہیں۔ غالبؔ اپنے خطوط میں کئی جگہ مراسلے کو مکالمے بنانے کا دعویٰ کیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں!

''مرزا صاحب! میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔'' (بنام: مہرؔ ۱۸۵۸)

غالبؔ معمولی جملوں سے وقتی کیفیت کا سماں باندھ دیتے ہیں جس سے ان کی تحریر تحریر نہ رہ کر تصویر بن جاتی ہے اور جب یہ باتیں ہم اُن کی زبانِ قلم سے سنتے ہیں تو ایسا لگتا ہے ہم ان کے پاس کھڑے ہیں ایک ایک بات کو دیکھ سُن رہے ہیں۔

غالبؔ کی ظرافت کی بنیاد ان کی فطری صلاحیت کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے حالیؔ نے انھیں ''حیوانِ ظریف'' لکھا ہے۔ غالب کے خطوط میں کہیں کہیں معمولی اور سطحی قسم کی ظرافت ملتی ہے جس کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا ہے، مثال کے طور پر غالب ایک خط میں لکھتے ہیں!

''روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلائے رکھتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حُقّہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم اور طرفہ روِش رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے روزہ بہلانا اور بات ہے۔'' (بنام: یوسف مرزا ۲۳؍جون ۱۸۵۳ء)

غالبؔ نے انفرادی و اجتماعی مصائب کو جس خلوص سے بیان کیا ہے وہ دل پر گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ غالبؔ کو غم والم کا سامنا کرنا پڑا، بچپن میں یتیمی کی زندگی، قید و بند کی سزا، پنشن کا بند ہونا یا پنشن کا نہ ملنا، اولاد سے محرومی، مفلسی و ناداری یہ سب تو ان کے ذاتی غم تھے۔ لیکن انھوں نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا، کشت و خون، عزیزوں کی موت، خاندانِ مغلیہ کی تباہی، دلی کی بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور غم والم کے ان تلخ تجربات نے ان کی شخصیت کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ جس سے ان کے اندر دردمندی، ہمدردی اور انسانیت کا ایک ایسا درد پیدا ہو گیا جس کو جگ بیتی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

۱۹۳۶ء کے بعد خط نگاری ایک نیا موڑ لیتی ہے کیوں کہ ۱۹۳۶ء کے بعد ملک میں حقیقت نگاری کا جذبہ لوگوں کے اندر بیدار ہوا اور نفسیات کے مطالعے کا ذوق پیدا ہوا۔ جس کے اثرات خطوط پر بھی رونما ہوئے اور خطوط میں بھی واقعیت کا لحاظ رکھا جانے لگا۔ خود کو چھپانے کا انداز جو اس سے پہلے کے خطوط میں ملتا ہے وہ یہاں ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ صاف گوئی کا رجحان عام ہونے کی وجہ سے خط نگاری کے آداب و رسوم میں بھی بدلاؤ آیا۔ آداب والقاب میں آزادی برتی جانے لگی۔

اس دَور کے خطوط میں زمانے کی افراتفری، پریشانی اور انسانی ہمدردی کے آثار بھی ملتے ہیں اور ادیب کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں بلکہ پیغام رسانی ہی کو اصل مقصود ٹھہرایا گیا۔ گویا حقیقت پسندی نے خط نگاری پر خاص اثر ڈالا۔ جوشؔ اپنے خطوط میں بے باکی اور صاف گوئی سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ فراقؔ کے خطوط میں فاضلانہ علمی شان دکھائی پڑتی ہے۔ اسی دَور میں کچھ خطوط کے ایسے مجموعے شائع ہوتے ہیں جس نے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ جیسے: ''زیرِ لب'' (صفیہ اختر کے خطوط جاں نثار اختر کے نام)، ''عزیزم کے نام'' (ڈاکٹر تاثیر کے خط اپنے شاگرد و عزیز محمود نظامی کے نام)، ''نقوشِ زنداں'' (سجاد ظہیرؔ کے خطوط اپنی بیوی کے نام)، ''صلیبیں میرے دریچے میں'' انگلش سے ترجمہ (فیض احمد فیضؔ کے خطوط اپنی بیوی کے نام) وغیرہ۔

ان خطوط میں ایک طرف ہجرت و فرقت کا بے باکانہ اندازِ بیان ملتا ہے تو دوسری طرف قید و بند کی صعوبتوں اور گھریلو الجھنوں، سماجی مسائل کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔ یہ خطوط نگاری کے جدا جدا مگر جدید ترین مذاق کی صحیح ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ غرض یہ خطوط دلچسپ بھی ہیں اور مفید بھی۔ ان سے ہمارے مشاہیر کی فضیلت اور فوقیت کا بھی پتہ چلتا ہے اور ہم ان کے خیالات سے مستفیض بھی ہو سکتے ہیں گویا زمانہ جیسے جیسے ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے اس میں خطوط نویسی کی مشق کم اور اس کا معیار بھی گرتا جا رہا ہے۔ ٹیلی فون، موبائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، اخبارات و رسائل، مناظرے، مباحثے اور تقریروں کو اظہار کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ اب خط نگاری کی جگہ ایس۔ ایم۔ ایس۔ اور اِی میل نے لے لیا ہے۔ چند منٹوں میں آپ اپنے دل کی بات کہہ کر سکنڈوں میں ہزاروں میل دور بھیج سکتے ہیں اور جواب بھی طلب کر سکتے ہیں۔ ٹکنالوجی کافی ترقی کر گئی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ڈاکخانے و ہرکارے کی اہمیت پوری طرح ختم ہو گئی ہے مگر کم ضرور ہو گئی ہے۔ اس لیے علمی اور ملکی مسائل پر خطوط کے ذریعے تبادلۂ خیال کا سلسلہ کچھ کم نظر آ رہا ہے پھر بھی اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے اکابرین کے خطوط ہمارے لیے بہت ہی قیمتی اثاثہ ہیں اور ہم ان کی افادیت کے معترف ہیں۔ ○■○

حسام الملک بہادر نے اپنی بڑی بھابھی نواب بیگم صاحبہ کو لکھا تھا۔ عبداللطیف اعظمی نے اس خط کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں اس خط کو پیش کرنا مناسب ہوگا جو عبدالطیف اعظمی کی تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا خط ہے۔

''نورچشمی راحت جان سعادت مندو جہاں قل سرسبز دود مان شرف بخشی خاندان بیگم سلمہا اللہ تعالیٰ۔ اس دعا کا عمل میرے تئیں حضرت چچا صاحب قبلہ سے جو عنایت ہوا اور کاغذ کے اوپر لکھوا کر بھیجا ہوں۔ ایک تمہارے واسطے اور عظیم جاہ کے واسطے یہ اول وآخر درود صبح وشام کو ایک دفعہ پڑھنا عمر ودولت زیادہ ہوئے۔''

''دورِ قدیم میں اردو خطوط پر نظر'' (عبدالطیف اعظمی) ص: ۷

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس دَور میں اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اردو میں خطوط لکھے گئے ہوں گے کیوں کہ اردو عام لوگوں کے علاوہ خاص لوگوں کے یہاں بھی پسند کی جانے لگی تھی۔ فورٹ ولیم کالج اور شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جو نثر بولی لکھی اور سمجھی جارہی تھی وہ خواص کی محفلوں تک پہنچ گئی تھی اور فارسی ادب کے مشہور ادباء وشعراء نے اردو میں لکھنا شروع کردیا تھا۔ اس سلسلے میں مرزا قتیلؔ، رجب علی بیگ سرور، غالب، امام بخش صہبائیؔ، مفتی صدرالدین آزردہ، خواجہ امام شہیداور غلام غوث بےخبرؔ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اردو مکتوب نگاری کے ارتقاء میں مرزا قتیلؔ کے خطوط ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ قتیلؔ کے صرف پانچ خطوط اردو میں ہیں جو ''معدن الفوائد'' (مرتبہ خواجہ امدادلدین) میں شامل ہیں۔

غلام غوث بےخبر کے مکاتیب کے مجموعے ''انشائے بےخبر'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے ربع اول میں سادگی کا کچھ میلان پیدا ہوا۔ بےخبرؔ کے خطوط میں سادگی ضرور ہے مگر وہ فارسی انشایئے سے نہیں بچ سکے۔ بےخبرؔ نے اپنے خطوط میں قدیم طرز کے القاب وآداب سے گریز کیا ہے۔ ''انشائے بےخبر'' کے تیں خطوط میں ایک خط بھی ایسا نہیں ہے جس میں قدیم طرز کے القاب وآداب پائے جاتے ہوں۔ مراسلے کو مکالمہ بنانے کا وصف بےخبرؔ اور سرور سے شروع ہوا اور غالب نے اسے درجۂ کمال تک پہنچادیا۔ بےخبرؔ مکتوب نگاری کے ارتقاء میں فورٹ ولیم کالج اور غالبؔ کے درمیان کی کڑی ہیں۔

رجب علی بیگ سرورؔ کے خطوط ایک طرف اپنے عہد کی تہذیبی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کی تحریروں کا اسلوب خود لکھنوی تہذیب کے مزاج کا مظہر ہے۔ سرور کے خطوط کے مجموعے ''انشائے سرور'' میں دو اسالیب ملتے ہیں ایک رنگین اور دوسرا سادگی سے پُر۔ لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط بھی اردو خطوط نگاری کے ارتقاء میں ایک مخصوص کردار ادا کرتے ہیں۔ غلام امام شہید کا شمار بےخبرؔ اور غالب کے ہم عصر مکتوب نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ غلام امام شہیدؔ غالبؔ اور بےخبرؔ کے قریبی دوستوں میں سے تھے امام شہیدؔ کے خطوط میں بےخبرؔ کے اسلوب کا رنگ نظر آتا ہے۔

اس وقت کے حالات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو وہ دور تبدیلیوں کا دور نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے روز افزوں تسلط واقتدار کے نتیجے میں فکرو نظر اور نظم ونسق کے مختلف سطحوں پر تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ اثرات ہر صنف پر نظر آتے ہیں۔ اسی طرح سے خطوط بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اس لیے کہ ابتدائی دَور کے خطوط کے بعد جو خطوط منظرِ عام پر آئے اس میں تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ فنی اعتبار سے خطوطِ غالبؔ میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو اردو مکتوب نگاری کو عظمت وبلندی عطا کرتی ہیں۔ یقیناً جب ہم غالبؔ کے خطوط پڑھتے ہیں تو القاب وآداب میں نیاپن، بےتکلفی اور بےساختگی پاتے ہیں۔ ان کے القاب وآداب سے مکتوب الیہ کی شخصیت کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے۔ عموماً غالب نہایت ہی سادہ سلیس القاب اپنے خطوط میں استعمال کرتے ہیں جیسے: صاحب، بھائی، بندہ پرور، میاں مرزا، میری جان، میرے مہرباں، مرزا علائی، مولائی، مہراج، جانِ غالب، مرزا تفتہ سخنداں، نورِ نظر ولختِ جگر، مشفق میرے، کرم فرما میرے وغیرہ۔ غالب خط کے اختتام میں بھی اپنی انفرادیت کے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی قافیے کا اہتمام بھی کرتے ہیں جیسے: مرگ کا طالب غالب، غالبِ علی شاہ، اسداللہ مضطرب، نجات کا طالب غالب وغیرہ۔

مرزا غالبؔ کے خطوط اردو خطوط نگاری میں منفرد امتیازات کے حامل ہیں۔ غالبؔ سے پہلے مکتوب نگاروں کے یہاں نجی اور خلوت کی زندگی کے اشارات بہت کم ملتے ہیں شاید ہی ایسے خط محفوظ ہوں گے جن میں کسی کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو ہو جو پوشیدہ رکھنے کے لائق ہو۔ غالبؔ نے اس رسم کو ترک کیا۔ غالبؔ کے خطوط میں کاروباری معاملات اور عام مطالب کے علاوہ ان کے زندگی کے ذاتی اور نجی حالات بھی ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی عشق بازی اور مےَ نوشی کا ذکر بھی غالبؔ کے یہاں ملتا ہے۔ اردو خطوط نگاری کی حیثیت سے غالبؔ پہلے نمایاں شخص ہیں۔ غالبؔ نے ابتدا میں رنگین مقفیٰ اور مسجع اسلوب اختیار کیا اور فارسی مکتوب نگاری کو فیض پہنچایا۔ اردو نثر کو ان کی سب سے بڑی دین مکتوب نگاری ہے۔ مکتوب نگاری کے ذریعہ انھوں نے اردو نثر کو نئی فکر عطا کی اور نیا اسلوب دیا۔ یہ فکر ان کے اسلوب کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ اردو نثر کو غالبؔ نے پہلی بار ٹھوس ادبی مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور خطوط نگاری کا وہ طریقہ اختیار کیا جو عام فہم اور عوام پسند تھا۔ اس سے پہلے کچھ اہلِ قلم نے اس طرف توجہ کی تھی جن مین غلام امام شہیدؔ اور غلام غوث بےخبرؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان کے یہاں وہ سادگی وصفائی نظر نہیں آتی جو غالبؔ کے خطوط میں ملتی ہے۔ غالب نے اس روِش کو اس طرح اپنایا کہ یہ راستہ خود ان کا ایجاد کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے یہاں تازگی، سادگی، بےساختگی اور فطری پن سبھی کچھ

کہ تقریباً چار ہزار سال پہلے چین کے بادشاہوں نے خطوط نگاری شروع کی تھی۔ مورخوں کا خیال ہے کہ بالکل صحیح طریقے سے خطوط نگاری کو ایران کے بادشاہ سائرس نے شروع کیا تھا اس کی اس ایجاد کا اعتراف یونانی تاریخ داں ہیروڈوٹس نے بھی کیا ہے۔ ایران کے بعد یہ طریقہ ساری دنیا میں اپنایا جانے لگا لیکن روم میں مکتوب نگاری کو باقاعدہ ایک فن بنایا گیا۔ سِسرو اسی عہد کا مکتوب نگار ہے جس کو مغربی مکتوب نگاری میں دنیا کا پہلا مکتوب نگار مانا جاتا ہے۔

مکتوب نگاری کی تاریخ کے سلسلے میں ایک خط کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ امیر تیمور لنگ نے ۱۳۰۴ء میں فرانس کے چارلس ششم کو ایک خط لکھا تھا جو اب نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے اس خط کا ذکر عبدالوہاب تروینی نے ''بست مقالہ'' میں کیا ہے۔

عربی زبان کے خطوط کا ذخیرہ یہ واضح کرتا ہے کہ عرب میں مکتوب نگاری کا فن غیر ترقی یافتہ شکل میں موجود تھا۔ خط لکھنا ایک پیشہ تھا۔ اسلام کے ظہور نے دیگر اصناف کے علاوہ عربی خطوط نگاری کو بھی نیا انداز عطا کیا۔ آنحضرتؐ کے عہد میں اس فن نے خاطر خواہ ترقی کی۔ جہاں تک امکان تھا بیرونِ عرب کے بادشاہوں اور امیروں کے پاس بھی دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے گئے یہ خطوط اب مرتب شکل میں دستیاب ہیں۔ رسولِ اکرمؐ نے کچھ خطوط کھال پر اور کچھ خطوط کھجور کے پتوں پر لکھوا کر مختلف مقامات پر روانہ کئے تھے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خطوط میں انشا پردازی کے بہترین نمونے ملتے ہیں اور یہ خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے خطوط ندوۃ المصنفین نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیے۔ اس سے پہلے ندوۃ المصنفین نے ۱۹۵۹ء میں پہلی بار حضرت عمر فاروقؓ کے خطوط شائع کیے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے خطوط جناب خورشید احمد فاروقی پروفیسر ادبیاتِ عربی دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیے۔ علی کرم اللہ وجہہ کے خطوط و تقاریر کا مجموعہ ''نہج البلاغہ'' کے نام سے بہت پہلے شریف علی بغدادی نے تیار کر کے کتابی شکل میں شائع کیا۔ بنوامیہ اور بنوعباس کے عہد میں انشا پردازی یعنی حکومت کے زیر اثر لکھے جانے والے مکاتیب کے فن کو باقاعدہ ایک نئی زندگی ملی اور ''دیوان الانشاء'' باقاعدہ ایک شعبہ کا قیام عمل میں آیا۔

مامون الرشید کے زمانے سے ہی فارسی زبان کو اچھی خاصی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ عجمیوں نے جہاں جہاں اپنی حکومتیں قائم کیں وہاں سے عربی کو نکال دیا۔ جس کا اثر فطری طور پر خط و کتابت پر بھی پڑا۔ یہاں سے فارسی انشا کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ جب ہلاکو خاں دولتِ عباسیہ کا خاتمہ کر دیا تو عربی کا رہا سہا وقار بھی ختم ہوگیا اور فارسی انشا کو فروغ پانے کا موقع مل گیا۔ فارسی میں بھی عربی کی طرح مکتوبات کا قابلِ قدر ذخیرہ موجود ہے۔ یہ مکتوبات کہیں فرامین کی شکل میں ملتے ہیں کہیں حکم ناموں کی شکل میں۔ کیوں کہ درباری سطح پر مکتوبات کا اپنا الگ انداز ہوتا ہے۔ فارسی مکتوبات کا بڑا ذخیرہ درباروں اور خانقاہوں کے تعلق سے دستیاب ہوتا ہے۔

عام طور سے ہندوستانی فارسی ادب میں ''اعجاز نامہ خسروی'' کو خطوط نگاری کا نقشِ اولین قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس فن پر مباحث کا آغاز ''اعجاز نامہ خسروی'' سے پہلے فارسی شعرا و نثر نگار اپنی تخلیقات میں کر چکے ہیں۔ قدامت کے لحاظ سے مجدالدین ابوالفتوح، احمد طوسی اور عبداللہ بن علی میاں جی ہمدانی کے خطوط ایک حکیمانہ مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ خواجہ عمادالدین محمود کے مکاتیب کا مجموعہ ''ریاض الانشاء'' کے نام سے موسوم ہے۔ فارسی مکاتیب میں ابوالفضلؔ کو اسلوبیات کے اعتبار سے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ انھوں نے خطوط نگاری کو نئے انداز سے پیش کیا جو دقیق اور پیچیدہ ضرور ہے لیکن رنگین نہیں، اس میں بناوٹ بالکل نہیں۔ اس وجہ سے ابوالفضلؔ کے خطوط ادب العالیہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔

مغرب میں خطوط نگاری نے بہت ترقی کی۔ سترہویں صدی عیسوی میں جیمس ہاویلؔ کے خطوط قابلِ ذکر ہیں۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں خطوط نگاری کا رواج بڑھا اور بڑھتا گیا۔ اس صدی میں ٹامس گرےؔ اور ولیم کوپر کے خطوط کے ساتھ لارڈ چیسٹر فیلڈؔ کے خطوط بھی بہت مقبول ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں سب سے پہلے خط کا رواج چندر گپت موریہ کے زمانے میں ہوا۔ یہ راجہ حضرت عیسیٰؑ سے کوئی تین سو سال پہلے ہوا تھا۔ کوٹلیہؔ کی کتاب ''ارتھ شاستر'' سے معلوم ہوتا ہے کہ چندر گپت موریہؔ کے دربار میں خطوط کی آمد و رفت عام بات سمجھی جاتی تھی۔

اورنگزیب عالمگیر کے فارسی خطوط کے مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ جن میں ''رقعاتِ عالمگیری'' اور ''کلماتِ طیّبات'' بہت اہم ہیں۔ فارسی خط نگاری میں مرزا مظہرؔ جان جاناں کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ مظہر جان جاناں کی طرح دوسرے افراد بھی گزرے ہیں جو فارسی کے ادیب و شاعر بھی تھے اور ان کا اردو سے بھی گہرا رشتہ تھا۔ اس فہرست میں محمد حسن قتیلؔ، مرزا غالبؔ، مولوی امام بخش صہبائیؔ، مومن خاں مومنؔ کے نام بہت اہم ہیں۔ فارسی مکتوبات کا سلسلہ عہدِ غالبؔ میں ملتا ہے اور اس کے بعد بھی۔

انیسویں صدی کے درمیان میں جب فارسی کی کاروباری حیثیت کو زوال ہوا تو فارسی کی جگہ اردو نے لے لی جس سے اردو میں مراسلت کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ جہاں تک یہ سوال کہ اردو میں مکتوب نگاری کی ابتدا کس نے کی تو اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے گرچہ عام طور پر غالبؔ کا نام لیا جاتا ہے مگر ایسا کہنا مناسب نہیں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب نے اس فن کو جلا بخشی۔

اردو میں مکتوب نگاری کی روایت ڈیڑھ سو برس سے زائد ہے۔ اردو کا پہلا دستیاب شدہ خط دسمبر ۱۸۲۲ء کا ہے جو کہ والد جاہ بہادر نواب کرناٹک کے بیٹے نواب

اردو میں خطوط نگاری کی روایت

ابوھریرہ خان

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں صرف انسان ہی کو یہ صلاحیت حاصل ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، اِس کے لیے دنیا میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ انسان کچھ علامتوں کے ذریعہ اپنے خیالات تحریر کی شکل میں ظاہر کرتا ہے اور دوسرے اسے پڑھ کر یہ جان لیتے ہیں کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے۔ دو اشخاص کے درمیان باہمی گفتگو ایک سماجی ضرورت ہے اور جب یہ عمل روبرو ممکن نہ ہو تو ہم اپنے خیالات کا اظہار لکھ کر کرتے ہیں۔ یہ تحریر ''خط'' کہلاتی ہے۔ ''خط'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی سطر یا تحریر کے ہیں لیکن عربی میں یہ لفظ اصطلاحی طور پر ''تحریر'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور مکتوب یا مراسلہ کے معنی میں بھی، اردو میں خط کے معنی ہیں: نوشتہ، لکھت، تحریر، دستاویز، سبزۂ رخسار، دستخط، نشان، علامت وغیرہ۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں خط میں مکتوب نگار اپنے خیالات وجذبات کو قلم بند کر کے مکتوب الیہ کو بھیجتا ہے۔ ادبی اصطلاح میں خطوط نگاری باقاعدہ ایک صنف ہے جس کے حدود ومعیار ہیں جس کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ جب صنف مکتوب نگاری اپنے ایک خاص رنگ میں بدل کر ادب کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو خطوط نگاری کے زمرے میں آ جاتی ہے لیکن اس کے متعلق اختلافات ہیں کہ خطوط نگاری کو باضابطہ ادبی صنف کا درجہ دیا جا سکتا ہے کہ نہیں؟ ایک فن کار ایک ہی وقت میں شاعر، نقاد، افسانہ نگار، ناول نگار اور ڈرامہ نگار ہو سکتا ہے لیکن ایک اچھا مکتوب نگار ہونا بہت مشکل ہے۔ غلام امام شہید اور بے خبر سے لے کر اب تک بہت کم مکتوب نگار ایسے ہیں جن کے خطوط کو ادبی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف لوگوں نے خط کی تعریف مختلف انداز سے کی ہے:

بقول مولوی عبدالحق! ''خط دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے اس میں وہ صداقت وخلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا''

''مقدمہ، مولوی عبدالحق'' تالیف مکتوباتِ حالی (مرتبہ سجاد حسین) ص: ۱۰

بقول آلِ احمد سرورؔ! ''اچھا خط وہ کہا جا سکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے جس میں بے تکلفی، بے ساختگی، خلوص، فطری رنگ، انفرادیت اور ذاتی تاثرات کی جھلک ہو۔ چنانچہ وہ خط جس میں علمیت کی نمائش، انشاپردازی کی شان، تکلف کا اظہار، خطابت کا جوش دکھایا جائے خط نہیں مضمون ہے۔''

''تنقیدی اشارے'' (آلِ احمد سرورؔ) ص: ۶۳

ادبی اصطلاح میں خطوط نگاری باقاعدہ ایک صنف ہے جس کے اپنے حدود ومعیار ہیں اور جس کی اپنی انفرادی ہیئت وتکنیک ہے۔ سید سلیمان ندوی صاحب کے بقول! ''خط کیا ہے؟ آپس میں دو آدمیوں کی بات چیت ہے۔'' خط لکھنا انسان کی تہذیبی علامت ہے اور یہ ایک عمدہ شغل بھی ہے۔ ہر پڑھا لکھا انسان اپنے عزیز واقارب، دوستوں اور بزرگوں کے نام خط لکھتا ہے، کبھی رسماً اور کبھی ضرورتاً۔ ''دنیا کے بہترین خطوط خواتین ہی کے قلم سے سرزد ہوئے ہیں'' اس جملے سے اتفاق کرنا ذرا مشکل ہے۔ یہ خورشید الاسلام صاحب کا اپنا خیال ہے۔ انھوں نے کوئی دلیل پیش نہیں کی ہے۔ اردو میں صرف چند خواتین کے خطوط ملتے ہیں جس میں صفیہ اختر اور رضیہ سجاد ظہیر کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

خطوط انسان کی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اثر آفرینی، حقیقت نگاری اور مافی الضمیر کی ادائیگی میں شکر گھول دیتے ہیں اور ادب میں اس صنف کو خاص اہمیت حاصل ہے اور خانگی وذاتی مکاتیب کی نوعیت واہمیت دیگر اشاعتی مکاتیب سے قدر مختلف ہوتی ہے اول الذکر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مکتوب نگار کی زندگی کے خفیہ گوشے اور فکر وعمل کے پوشیدہ زاویے روشن ہوا ٹھتے ہیں۔

مکتوب نگاری کی روایت بہت قدیم ہے اور مختلف زبانوں میں زمانہ قدیم سے رائج ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلا خط کب اور کس زبان میں تحریر ہوا۔ مغربی دنیا میں سِسرؔو کو قدیم ترین مکتوب نگار مانا جاتا ہے۔ مگر دنیا کا قدیم ترین خط غالباً وہ ہے جو قرآن کریم کی بعض تفسیروں کے مطابق حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کو اس وقت لکھا تھا جب وہ عزیزِ مصر بنا دیے گئے تھے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ جس کو آج خط کا نام دیا جا رہا ہے اُس وقت اس کی کیا شکل رہی ہوگی کیوں کہ مذکورہ خط کا متن ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے۔

بقول احمد حسن زیارت! ''دراصل خط کا اولین نمونہ اس خط کو کہا جا سکتا ہے جو حضرت سلیمانؑ نے ملکہ بلقیس کو ارسال کیا تھا۔ یہ خط اپنے پورے متن کے ساتھ قرآن پاک میں موجود ہے۔'' (''تاریخ ادب عربی''، احمد حسن زیارت، ص: ۶۴)

اس کے مستند اور معتبر ہونے میں کچھ شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ حاصل گفتگو یہ ہے کہ خطوط نگاری کا رواج زبان وادب میں قدیم عہد سے چلا آ رہا ہے۔ اندازہ یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ

بسم اللہ عدیم

''افسانچے''

''تلاش'':۔ بشیر اپنے دن بھر کے کاموں سے تھک کر چور جب گھر واپس لوٹا تو اُسے بچے، گندے، شور مچاتے دکھائی دیئے۔ گھر کی چیزیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ اس نے بیوی سے کہا!''میں نے ہمیشہ یہ خواہش کی ہے کہ بچے اور گھر صاف ستھرا ہو اور یہ ایک مثالی گھوارہ لگے۔'' مگر تم نے آج تک مری باتیں سنجیدگی سے محسوس کی اور نہ ہی مرے اس احساس کو سمجھا۔ تمہارے اس پھوہڑپن سے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔

اس کی بیوی نے یہ جو باتیں سنیں تو معمول کے مطابق ترکی بہ ترکی جواب دیا؛''تم جب بھی گھر میں آتے ہو تو مجھ ہی کو ہر وقت طعنے دیتے ہو۔ بچوں کو کبھی کچھ نہیں کہتے، میں اکیلی جان گھر کے کام کاج سنواروں یا کہ بچوں کی نگہ داری کرتی رہوں۔ مجھے دن بھر گھر کے کاموں سے دو گھڑی فرصت اور چین نہیں بلکہ بچوں اور گھر کے رکھ رکھاؤ کے بارے میں تمہاری کڑوی کسیلی باتیں سنتی رہوں۔ تمہاری ایسی باتوں سے 'مری عقل مٹی میں مِل گئی'...''

بات تلخی تک نہ پہنچے، بشیر ناراض ہونے کے بجائے مُسکرا کر بیوی سے مخاطب ہوا؛''بیگم اطمینان رکھو! مجھے آج سچائی معلوم ہو چکی ہے''۔ اس کی بیوی نے بڑے تیکھے تیور سے پوچھا؛....''کون سی سچائی کا پتہ چل گیا ہے؟....ذرا میں بھی تو جانوں''

بشیر نے بڑی شائستگی کے ساتھ بیوی سے کہا؛....''دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے بچے بڑے ہوشیار اور سمجھدار ہیں کیوں کہ وہ ''مٹی میں کھوئی تمہاری عقل تلاش کرتے ہیں۔''

ردِّعمل:۔ چار سالہ بشریٰ اپنی دادی کے ساتھ ایک قریبی رشتہ دار کے یہاں دعوت میں شریک تھی۔ رات جب کھانے سے فارغ ہوئی تو اس محلے کے کسی چوراہے سے کوئی مولوی کے وعظ کی آواز سنائی دی۔ دادی اُسے اپنے ساتھ بڑے شوق سے لے کر وعظ سننے کے لیے اس مقام پر عورتوں کی صف میں جا بیٹھیں۔ اپنی اس پوتی بشریٰ کو گود میں بٹھالیا۔ تمام لوگ بڑے غور سے احترام کے ساتھ مولوی صاحب کا وعظ سُن رہے تھے۔ کیوں کہ بیان پیارے نبیؐ کی سیرت کے متعلق ہو رہا تھا۔

اب سے پہلے بشریٰ نے اپنے گھر کے بڑے بزرگوں سے رسولؐ خدا کی عمدہ اور اچھی باتیں سُن رکھی تھیں کہ آپؐ خصوصی طور پر بہت ہی پیارے انداز اور میٹھے لہجے میں ایسی سیدھی سادی آسان ہدایت کرتے تھے کہ ہر دل پر اثر کر جاتیں۔ خدا کی عبادت کے ساتھ لوگوں کو آپس میں ملنساری، خلوص و ایثار کا درس سکھاتے تھے۔

معصوم ننھی بشریٰ گود میں کبھی اس طرف کو کبھی اُس طرف رُخ بدلتی اور کبھی گود سے کھسک کر فرش پر آجاتی۔ دادی نے اس کی جب یہ حرکتیں دیکھیں تو بولیں اطمینان سے بیٹھو ادب سے بات سُنو۔ یوں وعظ سُنتے کچھ وقت گزر گیا...اچانک بشریٰ نے اپنی دادی سے کہا...''گھر چلیے...یہ مولوی صاحب تو بڑے زور زور سے چیخ رہے ہیں۔''

بات دراصل یہ تھی کہ محترم مولانا اپنی علمی کروفر میں بہت جوشیلے انداز سے نبیؐ کی سیرت بیان کر رہے تھے۔○■○

92/2 سنت کبیر مارگ، جوہر یواڑہ، مہاجنٹھ، بُرہانپور (ایم پی)

براجمان ہیں اور وہ ان کا صحیح استعمال بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بچوں کو دینیات کا سبق اچھی طرح پڑھا کر اعلیٰ جدید تعلیم دلائی ہے۔ ایک لڑکا ڈاکٹر ہے تو دوسرا کالج میں پروفیسری کر کے کھا کما رہا ہے۔ ہے نا! تعجب خیز اور حیرت انگیز بات۔ سچ مچ مولانا راکٹ بڑے کام کی چیز ہیں۔

مولانا راکٹ کی مولانیت اور شخصیت کا ایک لائق توجہ پہلو یہ بھی ہے کہ وہ خدائے واحد کے پرستار اور شرک سے بیزار ہیں۔ پیری مریدی کو بکواس اور قبر پرستی کو دماغی خناس سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں شیعہ سنی کے تنازعے اور بریلوی دیوبندی کے مسئلے کو بھی بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھتے۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ کو مدِ نظر رکھ کر وہ کبھی کبھی ملت کے نوجوانوں سے سوال کر بیٹھتے ہیں کہ؛ ؎

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

ہماری طرح تبلیغی جماعت والے بھی ان کی نگاہ میں نہیں جچتے۔ ان کی رائے میں ایسے لوگ تبلیغ کم ''شو'' زیادہ کرتے ہیں۔ آج یہ خدائی فوجدار بھوپال میں جمع ہو کر کباب و کلیجے اڑا رہے ہیں تو دو چار دن بعد نینی تال میں قورمہ بریانی حلق کے نیچے اتار رہے ہیں۔ شہروں شہروں گھومتے، سیر کرتے ہیں لیکن گاؤں کی کوئی خاک نہیں چھانتا جہاں تبلیغ کی اشد ضرورت ہے اور اس پر طرہ یہ کہ صرف اپنے تبلیغی لٹریچر سے ملتِ اسلامیہ کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔

خلاصۂ تحریر یہ کہ مولانا راکٹ کی مشغولیات و مصروفیات، حرکات و سکنات اور ان کی عادات و عبادات کا ذرا بھی جائزہ لیا جائے تو ان کی شخصیت مسکرا کر یہی کہتی ہوئی نظر آئے گی کہ؛ ؎ یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ

کالی پلٹن روڈ، پل محمد خاں، ٹونک (راجستھان) ۳۰۴۰۰۱

''ہند کو جنت بنائیں دوستو''

ڈاکٹر شفیق اعظمی

آؤ کچھ کر کے دکھائیں دوستو
ہند کو جنت بنائیں دوستو

اب اندھیرے کا نہ ہو نام و نشاں
علم کی شمعیں جلائیں دوستو

عزم پختہ ہو عمل کی راہ میں
غم جو ہو ہنس کر اٹھائیں دوستو

منزلیں آسان ہوں سب کیلیے
راستہ ایسا بنائیں دوستو

لالہ و گل مسکرائیں ہر طرف
اس طرح گلشن سجائیں دوستو

پیکرِ گیتی کو دے کر رنگِ نو
عظمتِ ہستی بڑھائیں دوستو

وقت کی رفتار بھی ہو شرمسار
یوں قدم آگے بڑھائیں دوستو

شادمانی چوم لے بڑھ کر قدم
نقشِ غم ایسا مٹائیں دوستو

ہے شفیق اعظمی کی یہ دعا
ابرِ رحمت بن کے چھائیں دوستو

پٹھان ٹولہ، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی۔ ۲۷۶۳۰۵

علاوہ ازیں مختلف پارٹ ٹائم جاب الگ سے ان کو جکڑے ہوئے ہیں، کہیں جھاڑ پھونک کے ذریعے علاج ومعالجہ کرکے ڈاکٹروں کی روزی پر لات مار رہے ہیں تو کہیں دینی ٹیوشن کے بہانے ماسٹروں کی کوچنگ کو للکار رہے ہیں۔ آج کلّو خاں قصاب کے مکان پر محفلِ میلادخوانی برپا کیے ہوئے ہیں تو کل ننو خاں نداف کی حویلی میں بیٹھے اس کے سواچار سالہ بیٹے کو بسم اللہ پڑھا رہے ہیں۔ مسلم قوم کی شادی غمی کے ہر بلند و پست پر ان کا کنٹرول ہے بلکہ مہد سے لے کر لحد تک کے جملہ کام انھیں کے زیرِ نگرانی سرانجام پاتے ہیں۔ ایک جان سو جنجال کی کہاوت اُن پر فٹ کرکے دیکھ لو۔ اگر فٹ نہ ہو تو مابدولت کان پکڑ کر برسرِ مجمع سو اُٹھک بیٹھک کریں گے۔ ہماری تو جب بھی ان سے بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی کے مصداق علیک سلیک ہوتی ہے تو دل ہی دل میں کہتے ہیں؛ ؎ تجھ سا بھی کوئی مردِ مسلماں نہیں دیکھا

مولانا راکٹ جیسا کہ آپ نے دیکھا ویسے تو وہ بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں مگر ہمیں ان کی یہ ادا بہت پیاری لگی ہے کہ وہ مذہبی معاملات پر اپنی دوٹوک رائے دیتے ہیں اور فروعی غیر فروعی باتوں میں فضول کی جھنجھٹ پیدا نہیں کرتے۔ ایک بار سرِ راہ چلتے چلتے اور ان کے ساتھ دُلکی دوڑ دوڑتے دوڑتے ہم ان کی رائے پوچھ بیٹھے: ''مولانا صاحب! ہم نے ایک دوسرے مولوی صاحب سے سنا ہے کہ بحالتِ سجدہ اگر پاؤں کا انگوٹھا بھی زمین کی سطح سے اُٹھ جاتا ہے تو نماز میں خلل واقع ہو جاتا ہے، یہ کہاں تک درست ہے؟'' بغیر رُکے فرمانے لگے:

''برخوردار! آج کل کے کٹھ مُلّاؤں، مولویوں نے یہ وتیرہ بنالیا ہے کہ وہ فروعی معاملوں میں لوگوں کو الجھا دیتے ہیں۔ کیا کریں وہ اسی طرح اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ ارے خدائے رحیم وکریم نے تو اتنی چھوٹ دے رکھی ہے کہ جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ نماز کو ہی لیں تو بندہ کھڑا ہونے کی سکت نہ رکھتا ہو تو بیٹھ کر یہ فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ اگر بیٹھ نہ سکے تو لیٹ کر پڑھ سکتا ہے۔ اور تو اور اشاروں میں بھی نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ وضو میں قباحت رُکاوٹ ہو تو تیمّم بھی جائز ہے۔ کہاں کی انگلیاں اور کیسا انگوٹھا''

مولانا راکٹ اس پچڑے میں نہیں پڑتے کہ کوا حلال ہے یا حرام اور قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دینا جائز ہے یا ناجائز۔ وہ تو اِس پر نظر رکھتے ہیں کہ 'بھنور خاں' بھنور خاں'' بنا رہے، کہیں 'بھنور لال'' نہ بن جائے۔ ان کو ملال ہے کہ مسلم تدبر نہیں کرتا ورنہ دنیاداری اور دین داری سے ایسا عطر کشیدہ کرسکتا ہے جس کی خوشبو سے ایک عالم مہک اُٹھے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ اس راکٹی یُگ میں مولانا راکٹ کی ہستی عجائبات میں سے ہے۔ ممکن ہے کہ ہزاروں سال نرگس اپنی بےنوری پہ روئی ہو...... تب جاکر مولانا جیسا نامور دیدہ ور پیدا ہوا ہو۔ مولانا کے حلیہ شریف کو دیکھ کر آپ اپنی کھوپڑی میں دقیانوسی لفظ دہرا سکتے ہیں ورنہ وہ بڑے روشن خیال دیندار ہیں۔ وہ مذہب کو اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہوئے بھی اسے کمبل نہیں بناتے کہ کہیں دنیا کے رہیں نہ دین کے۔ اگر آپ ان کے دولت خانہ پر جا دھمکیں تو ان کا مکان ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' نظر آئے گا۔ گھر کا ہر ایک فرد عورت مرد نماز پنج وقتہ کا پابند، روزمرہ تلاوتِ قرآن پر عمل پیرا اور امورِ دینیہ پر کاربند ملے گا۔ اسی کے ساتھ ان کی روشن خیالی کے جلوے بھی دکھائی دیں گے۔ اگر آپ چونکنے کی ایکٹنگ نہ کریں تو ہم آپ کو بتائیں کہ مولانا کے گھر میں فریج، کولر ہی نہیں بلکہ ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن بھی

انشائیہ

”مولانا راکٹ“

مختاؔر ٹونکی

ایک ہیں مولانا راکٹ (ہوگا کوئی ایسا بھی جو راکٹ کو نہ جانے؟)

آپ نے بہت سے مولانا ملاحظہ کیے ہوں گے اور راکٹ بھی بہر حال دیکھے بھالے ہوں گے مگر مولانا راکٹ کے بارے میں دیکھا نہ سُنا ہوگا اور نہ ہی ان سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ بڑی عجیب وغریب شخصیت ہیں مولانا راکٹ۔ صورت شکل اور وضع قطع سے پوری طرح مولانا اور قد کاٹھی سے بالکل راکٹ یعنی اسمِ بامسمیٰ۔ یقین واثق ہے کہ ان کے نجیب الطرفین والدین نے اپنے اس فرزند ارجمند کا کوئی پیدائشی تاریخی یا پیار دُلار کا نام رکھا ہو مگر اب تو وہ شیطان کی طرح مولانا راکٹ کی عرفیت سے مشہور ومعروف ہوگئے ہیں بقول شیکسپیئر؛ ”بھلا نام میں کیا رکھا ہے؟“ مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ نام ان پر خوب جچتا ہے۔ وہ غالبؔ کی طرح بے ننگ ونام نہیں ہیں بلکہ بڑی نامی گرامی ہستی ہیں۔

مولانا راکٹ ویسے تو واقعی مولانا ہیں۔ فارغ التحصیل، سند یافتہ، شرعی پائجامہ ہولڈر اور باقاعدہ داڑھی دار، امورِ شرعی اور مذہبی مسائل سے خبر دار۔ پہلی بار اگر کوئی ان سے مشرف بہ دیدار ہو تو کہہ نہیں سکتا کہ وہ کوئی مضحکہ خیز قسم کی چیز ہیں۔ بس ہر کام میں ان کی چیتے جیسی چستی و پھرتی، آدمی کو چونکاتی ہے۔ وہ اتنی تیزی سے اٹھک بیٹھک اور چلت پھرت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کوئی کٹھ پتلی کسی کی انگلیوں کے اشارے پر ناچ رہی ہو۔ مثال کے طور پر اگر وہ بائی دی وے بازار کی سڑک سے گزر رہے ہوں تو بالکل ایسا لگتا ہے گویا بندوق کی گولی سرسراتی ہوئی بھاگی چلی جارہی ہو۔ بڑے راکٹ رفتار ہوئے ہیں۔ شاید ان کے زبان زد نام کی وجہِ تسمیہ بھی یہی ہو کہ برق رفتاری اور تیزی وطراری ان کی نس نس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور وہ اپنے ہر ادنیٰ واعلیٰ کام کو کرنے میں انتہائی جلد بازی دکھاتے ہیں۔ اسی ضمن میں آپ جناب پر واضح ہو کہ ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں ہم تراویح پڑھنے اسی مسجد میں پہنچ گئے جہاں مولانا راکٹ قرآن شریف سنا رہے تھے۔ بخدا یقین کریں کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گڈمڈ آوازوں کا ایک آبشار گر رہا ہو۔ ہم گوش بر آواز تھے بلکہ ہمہ تن گوش ہی گوش تھے مگر ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ بیس رکعتوں میں ہمیں مطلق پتہ نہیں چلا کہ مولانا راکٹ نے کہاں سے اسٹارٹ کیا اور کہاں دی اینڈ کر دیا۔ اتنا ضرور تھا کہ ”اللہُ اکبر“ کی آواز پر رکوع میں جھکتے اور سجدے میں گر جاتے تھے۔ ہم نے نہیں کہا مگر آپ ایسا چانس لیں تو جھک ہار مار کر آپ کو کہنا پڑے گا۔ راکٹ سا گزر جائے ہے آواز تو دیکھو

مولانا کے محلے میں رہنے والے بڑے بوڑھوں سے روایت ہے کہ انھوں نے اس دنیا میں قدم رنجہ فرمانے میں بھی نہایت تیز گامی دکھائی تھی اور شکمِ مادر سے سات مہینے میں ہی برآمد ہوگئے تھے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات شاید اسی کو کہتے ہیں۔ مولانا راکٹ کی لیاقت اور شرافت چاردانگِ قصبہ میں اظہر من الشّمس ہے۔ پیشہ تو انھوں نے ماشاء اللہ امام بخاری کا اپنا رکھا ہے۔ امامت میں سیاست اور سیاست میں امارت کے پہلو خوب نکال لیتے ہیں۔ سائڈ بزنس کے طور پر انھوں نے تعویذ گنڈوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔ نذر و نیاز کی بات چھوڑیے۔ مخلوقِ خداوندی کی خدمت گزاری ان پر واجب ہے اس لیے درد ِملت ان کو ہر دم بے قرار رکھتا ہے، وہ تھرک تھرک کر اور تڑپ تڑپ کر قوم کی خدمت میں سخنے، بدنے جٹے رہتے ہیں۔

غزلیں

خان عتیق آفریدی

ماں کی ممتا سے شرابور دعا، ہم ہی تھے
وقت کو جن پہ کبھی ناز رہا ہم ہی تھے
مُسکراتے ہوئے غنچوں کی نوا ہم ہی تھے
جن کے سائے میں رہے ناز وادا ہم ہی تھے
میکدہ تھیں تری آنکھیں ترے لب جام وسبو
موسمِ ابر کی گھنگھور گھٹا ہم ہی تھے
آپ آتے تو سہی میرے سیہ خانے میں
جو چراغوں کو جلا دے وہ ہوا ہم ہی تھے
کاش اس بات کا احساس ہی ہوجائے اُنھیں
دشت وصحرا میں جو گونجی وہ صدا ہم ہی تھے
یہ بھی ممکن ہے کہ اب اس کی سزا بھی پائیں
یہ بھی سچ ہے کہ گنہگارِ وفا ہم ہی تھے
ہم نے صحراؤں کو گلزار بنایا ہے عتیق
وقت بے وجہ جنھیں بھول گیا ہم ہی تھے

غیر طوغان، رامپور، یوپی
موبائل نمبر:0935821682

ظفر علی ظفر

سلگتے ہونٹوں پہ شبنم کی پیاس کافی نہیں
جنوں کی دھوپ میں قطرے کی آس کافی نہیں
دلوں میں خوشبوؤں کا آنا جانا ہے لازم
حیات کی رگوں میں چلتی سانس کافی نہیں
بہارِ گل میں چمن لالہ زار ہو جائے
کیاریوں پہ اُگی سبز گھاس کافی نہیں
وفا خلوص ومحبت کی اوڑھ لیں چادر
کہ زرق برق کے ہم پر لباس کافی نہیں
کبھی ہوں زلفِ پریشاں کبھی ہوں آنکھیں نم
کہ میّتوں پہ ہو چہرہ اداس کافی نہیں
ہم اپنے قوتِ بازو سے کچھ تو کر جائیں
کہ پتھروں سے کوئی التماس کافی نہیں
وہ میری روح میں تحلیل کردے اپنی روح
وجود اس کا ظفر میرے پاس کافی نہیں

اردو بازار، رحمانیہ اسکول اسٹریٹ
آسنسول۔۲(مغربی بنگال) فون:9641380783

نجیب گھبرا گیا اور اُسے سمجھانے لگا۔ جاتے وقت نجیب نے شارب کو دیوانہ وار چوما، پھر ثانیہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا: ''ثانیہ دیکھو! اپنا اور شارب کا خیال رکھنا۔ میں انشاءاللہ تعالیٰ تین سال بعد لوٹ آؤں گا....اور ہاں میں سوائے اپنی خیریت کے ساتھ پہنچنے کے علاوہ شاید کوئی خط نہ لکھ سکوں ابھی سے بتا رہا ہوں، وہ اس لیے کہ کام بہت زیادہ واہم ہے، پریشان نہ ہونا۔ میں اپنے شارب کے لیے ڈھیروں چیزیں لاؤں گا۔ اِسے کسی چیز کے لیے سِسکنے نہیں دوں گا۔ اس کی کوئی خواہش ردنہیں ہوگی...'' اتنا کہہ کر نجیب نے اپنے آنسو رومال میں جذب کر کے سب پر الوداعی نظر ڈالی اور پھر خدا حافظ کہہ کر تیزی سے چلا گیا۔ وہ کیا گیا ساری رونق ہی ساتھ لے گیا۔ کچھ عرصہ تک تو سب ٹھیک ٹھاک چلتا رہا مگر پھر ثانیہ کی بدقسمتی کے دن روز بروز بڑھتے گئے۔ ذرا سی شرارت پر شارب دادی اور پھوپھی کے ہاتھوں روئی کی طرح دُھن دیا جاتا۔ ثانیہ تڑپ کر رہ جاتی.......... ''کیوں چلے گئے نجیب....شارب کی دُرگت بنوانے کے لیے..'' پھر تو روز کا معمول بن گیا۔ ساس (خالہ) اور نند ناظمہ بات بات پر طعنہ دیتیں۔ ثانیہ کا اِس گھر میں رہنا دوبھر ہوگیا۔ نہ کھانے کی فکر نہ پینے کی فکر دِن رات آنسو بہاتی رہتی۔ برداشت کی بھی آخر حد ہوتی ہے۔ ہر وقت شارب کا سِسکنا وہ برداشت نہ کر سکی۔ یتیم لڑکی تھی سوائے سسرال کے کوئی قریبی رشتہ دار نہیں تھا۔ قریب ہی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑے نما کمرہ بیکار پڑا تھا اسی میں پناہ لی۔ کچھ برتن وزیورات ساتھ لے لیے تھے۔ دھیرے دھیرے زیورات بِک گئے اور آج فاقوں کی نوبت آ گئی تھی........کہتے ہیں نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ سو، نہ جانے رات کے کون سے پہر وہ نیند کی پُرسکون وادی میں کھوگئی..........فجر کے وقت مؤذّن کی تیز آواز سے ثانیہ ہڑبڑا کر کلمہ پڑھتی ہوئی اُٹھ بیٹھی، سرد پانی سے وضو کر کے کپکپاتے ہوئے خدا کے روبرو کھڑی ہوگئی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر گڑ گڑانا شروع کر دیا۔ ''لوٹ آؤ نجیب خدا کے لیے لوٹ آؤ....تم نے تو کہا تھا میں تین سال بعد لوٹ آؤں گا.....کیا بھول گئے اپنا عہد؟....شارب بھی اب چار سال کا ہوگیا ہے.....تم تو کہتے تھے میں اپنے بیٹے کے واسطے جا رہا ہوں...اِسے سِسکنا نہیں پڑے گا، فریاد نہیں کرنی پڑے گی.....مگر یہ تو سب الٹا ہوگیا...وہ کل سے بھوکا سِسک رہا ہے..... یا خدا تو نجیب کو غیب سے بھیج دے اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوگا۔ ایک دن تو جیسے تیسے گزر گیا مگر آج کا دن کیسے گزرے گا کیا کھائے گا میرا شارب۔ خدا کے لیے آجاؤ نجیب.......ثانیہ دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا کر زاروقطار روتے ہوئے سجدہ میں گر گئی۔

اچانک ہی جھونپڑی کا ٹوٹا پھوٹا دروازہ زور زور سے ہلنے لگا....کوئی اندھادھند دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ثانیہ نے سوچے سمجھے بغیر دروازہ کھول دیا ''نجیب؟'' ثانیہ کو اپنی آنکھوں پر دھوکہ لگا۔ دروازے پر اُس کا مجازی خدا ''نجیب'' کھڑا تھا...... ''ثانیہ!'' نجیب بے تاب ہو کر چیخ اُٹھا ''یہ.....یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے''.....ثانیہ سِسک اُٹھی مگر زبان نہیں کھُل پائی۔ نجیب اس کی حالت دیکھ کر تڑپ گیا۔ ''ثانیہ ابھی میرا کام ختم نہیں ہوا ہے کم سے کم ایک سال اور لگتا مگر میں چلا آیا، جانتی ہو کیوں؟ میں نے ایک بہت ہی بھیانک خواب دیکھا تھا بس پھر مجھ سے وہاں رہنا مشکل ہوگیا اور چلا آیا راستے میں مستقیم اور صبا ملے تھے انھوں نے بتایا کہ تم یہاں ہو۔ میں سیدھا یہیں چلا آیا.....میں جانتا ہوں ناظمہ اور امّی نے تمہیں ضرور ستایا ہوگا کیوں کہ وہ میری پسند کی شادی سے خوش نہیں تھیں۔'' ثانیہ نے اطمینان کا گہرا سانس لیا، اب اس کا ہمسفر اس کے ساتھ تھا، اس نے خدا کا تہہ دل سے شکر ادا کیا۔ ''میرا شارب سو رہا ہے''.....نجیب نے شال سے ڈھکے شارب کو دور سے دیکھ کر کہا۔ اس کا چہرہ بیٹے کو دیکھ کر دمک اُٹھا۔ نجیب ثانیہ اور شارب کے لیے ڈھیروں قیمتی سامان لایا تھا۔ دس پندرہ خوبصورت ایٹومیٹک کھلونے تھے.....تھوڑی ہی دیر میں صبح کا اجالا ہر سُو پھیل گیا۔ مگر بھوکا شارب ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ ''اب شارب کو اُٹھا دیجیے...'' ثانیہ نے نجیب سے کہا۔ نجیب نے سارے کھلونے ہاتھ میں لیے اور شارب کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ دِل بیٹے کا چاند سا مکھڑا دیکھنے کو مچل رہا تھا، ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ثانیہ باپ بیٹے کا ملاپ دیکھنے کے لیے بے چین تھی.....نجیب نے دھیرے سے شال ہٹائی۔ دوسرے ہی لمحہ وہ خوف سے بُری طرح چیخ اُٹھا۔ ''شارب!!!'' شارب کی جگہ شارب کی اکڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ بے نور سی آنکھیں.....باپ سے ملے بغیر شارب ابدی نیند سو گیا تھا..... ''ثانیہ'' وہ تو سکتے کے عالم میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی....پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی نجیب کو دیکھتی تو کبھی ساکت لختِ جگر شارب کو......کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شوہر کے آنے کی خوشی منائے.... یا بیٹے کے رخصت ہونے کا غم.....نجیب کے ہاتھوں سے کھلونے گر کر شارب کے اِرد گرد پھیل گئے......

یہ بہار کیسی آئی جو خزاں بھی ساتھ لائی

○■○

جامعہ مڈل اسکول، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

افسانہ

”سسکتے ارمان“

شائستہ نصیر

اجل سے زندگی ٹکرا رہی ہے، کیا تم نہ آؤ گے؟
تمنّا کی کلی مرجھا رہی ہے، کیا تم نہ آؤ گے؟

امّی مجھے بھوک لگی ہے.....بھوک سے بلکتے شارب نے نماز پڑھتی ثانیہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔سلام پھیر کر ثانیہ نے اُسے آغوش میں بھر لیا ”شارب! اللہ میاں سے دعا مانگو....“ ”نہیں امّی اللہ میاں کچھ نہیں دیتے“ شارب نے ماں کو جواب دیا۔”نہیں ..نہیں شارب ایسی باتیں نہیں کرتے، اللہ میاں ناراض ہو جاتے ہیں“ ثانیہ نے سمجھایا۔ ”امّی میں روز تو دعا مانگتا ہوں، اللہ نہیں دیتے“ ”دیتے ہیں بیٹا اللہ ضرور دیتے ہیں“ ثانیہ روہانسی ہو گئی۔”کب دیتے ہیں.....مجھے بھوک لگی ہے“۔شارب بھوک سے بے چین سِسک رہا تھا۔ثانیہ کہاں سے دیتی اُسے کھانے کو وہ خود بھوکی تھی۔چاروں طرف نظریں دوڑائی بوسیدہ سی جھونپڑی، ٹاٹ کا پردہ، تین برتن، پانی کی صراحی اور کچھ خالی ڈبّے .....جو اُس کی بے بسی کا مذاق اُڑا رہے تھے۔

”جاؤ بیٹے دادی ماں کے گھر چلے جاؤ شاید وہ تمہاری یہ حالت دیکھ کر کچھ دے دیں۔“ ”نہیں امّی وہ مجھے دیکھ کر دروازہ بند کر لیتی ہیں“ شارب نڈھال سا ماں کی گود میں گر گیا، اپنے جگر کے ٹکڑے کی یہ حالت دیکھ کر ثانیہ خون کے آنسو رو پڑی ”اُف خدایا! میری مدد کر...اپنے غیب سے کچھ دے اِس معصوم کو“ ثانیہ نے گِڑ گِڑا کر دعا کے انداز میں ہاتھ پھیلا دیے۔شارب کا چہرہ بھوک سے پیلا پڑ رہا تھا۔ثانیہ نے فرش پر بستر بچھایا اور شارب کو لٹا کر اپنی اکلوتی شال سے اُسے ڈھک دی۔شارب نے پھر کسمسا کر کروٹ لی اور سو گیا۔ثانیہ بھی اس کے قریب لیٹ گئی۔سردی زوروں پر تھی۔ہوا کے بچاؤ کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔رات کا سنّاٹا... بارہ بجے کا وقت....ثانیہ کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان نہیں تھا، سردی سے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ایسے میں ثانیہ کو اپنے شوہر نجیب کی یاد ستا رہی تھی، تڑپا تڑپا کر رُلا رہی تھی۔شروع سے آخر تک کے واقعات پردۂ فلم کی مانند اس کی نظروں میں گردش کرنے لگے۔اُس نے ننھے شارب کے ریشمی بالوں پر اپنے کپکپاتے لب رکھ کر آنکھیں موند لیں گویا ماضی و حال سے فرار حاصل کرنا چاہتی ہو مگر بے سود........................

کتنا پُر رونق دن تھا جب وہ دولہن بن کر اپنے گھر کو خیر باد کہہ نجیب کی زندگی میں چلی آئی تھی۔ثانیہ جو اپنے والدین کی اِکلوتی بیٹی تھی۔ابھی شادی کو ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ ایک حادثہ میں اُس کے والدین جاں بحق ہو گئے۔والدین کی موت کا زبردست اثر اُس پر ہوا مگر پھر وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ یہ زخم بھر گیا۔نجیب ثانیہ کی خالہ کا بیٹا تھا۔خوبصورت، ذہین، روتوں کو ہنسانے والا، ہنس مُکھ سا شرارتی۔ثانیہ نے ہنسی خوشی گھر سنبھال لیا تھا، نند کو کبھی کام نہیں کرنے دیتی تھی۔نجیب اس کی محبت اور خوبیوں کو دیکھ کر خوشی سے سرشار ہو جاتا۔پھر شارب کی پیدائش نے سب کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔سب ملنے والوں میں مٹھائی تقسیم کی، غریب لوگوں کو کھانا کھلایا، مہترانی کی ضد پر اُسے نیا جوڑا اور چاندی کی پائل بھی دی۔دِن گزرتے گئے۔اب شارب ایک سال کا ہو گیا تھا۔کہتے ہیں خوشی یا غم ہمیشہ ساتھ نہیں رہتے، سو وہ الم ناک دن ثانیہ کی خوشگوار زندگی میں ہلچل مچا گیا.......

ایک دن نجیب نے یہ کہہ کر دھماکہ کر دیا کہ وہ تین سال کے لیے امریکہ جا رہا ہے، کام کے سلسلے میں...سب بے چین ہو اُٹھے۔بہن، ماں باپ سبھی پریشان ہو گئے۔یہ خبر سُن کر ثانیہ کے تو ہوش و حواس اُڑ گئے، ہمّت جواب دے گئی، آنکھوں نے بے اختیار رِم جھم رِم جھم برسنا شروع کر دیا۔ثانیہ کی یہ حالت دیکھ کر

غزلیں

ڈاکٹر ایم آئی ساجد

جو وقت آئے تو جاں بھی نثار کرتا ہے
وفا کے نام پر وہ زیر بار کرتا ہے

بھلائے رکھتا ہے دن بھر وہ میری چاہت کو
چراغ جلتے ہی پھر انتظار کرتا ہے

خطوط لکھتا ہے لیکن پتہ نہیں دیتا
نہ جانے کون ہے جو ہم سے پیار کرتا ہے

وہ بے وفا ہے، فریبی ہے سچ سہی لیکن
اُسی سے ملنے کو جی بار بار کرتا ہے

بڑے خلوص سے ملتا ہے جب بھی ملتا ہے
مگر یہ عیب ہے پیچھے سے وار کرتا ہے

وہ ڈور ہاتھ میں لیکر مہکتے رشتوں کی
برستی آنکھوں سے دریا کو پار کرتا ہے

کسی سے کیسے نبھائے گا دوستی ساجدؔ
گلوں کو اپنے ہی حق میں جو خار کرتا ہے

○■○

این پی اردو پرائمری اسکول نمبر 4
ضیا کالونی، خام گاؤں (ایم۔ایس) 444303

ڈاکٹر ذکی طارق

شہر میں موسمِ پُر آب کہاں ملتے ہیں
وہ پرندے جو ہیں نایاب کہاں ملتے ہیں

اُڑ کے آتے تھے جو سُرخاب کہاں ملتے ہیں
اب کسی گاؤں میں تالاب کہاں ملتے ہیں

جن کی ہر بات میں ہوتی تھی مروّت شامل
ڈھونڈنے سے بھی وہ احباب کہاں ملتے ہیں

ختم ہیں ساری روایات مری نسل کے ساتھ
اب وہ تہذیب، وہ آداب کہاں ملتے ہیں

کہیں طوفاں نہ تلاطم نہ ہے ٹوٹی کشتی
اب سمندر میں بھی گرداب کہاں ملتے ہیں

ہجر کے دن بھی گئے وصل کا موسم بھی گیا
جاگتی آنکھوں کو بھی خواب کہاں ملتے ہیں

جن کے احساس سے آنکھوں کو نمی ملتی تھی
غم کے دریا جو تھے پایاب کہاں ملتے ہیں

شہر تو اپنا پُرانا ہے مگر ڈھونڈو ذکیؔ
اپنے اسلاف کے آداب کہاں ملتے ہیں

○■○

564۔کیلا روڈ، گئو شالا پھاٹک، غازی آباد، یوپی

آج چانس ہے، کیوں نہ اس سے رسم وراہ بڑھالی جائے...؟ پھر میرے پیرینٹس نے بھی تو مجھ کو خود پسند کرنے کی چھوٹ دے رکھی ہے، کیوں نہ آج اس کو پسند کر کے اپنی دانش مندی کا ثبوت دیا جائے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ہے کس کاسٹ کا....؟ کسی غیر کاسٹ والے کو پسند کر لینا دانش مندی تو نہیں، وہ تو بہت بڑی بیوقوفی ہوگی۔ اپنی خودداری چھوڑ کر اُس سے پوچھ کیوں نہ لیا جائے، اور پھر میرے مُنہ سے نکل گیا، ’’آپ کا نام....؟‘‘ ’’انسان‘‘، اُس نے روکھا سا جواب دیا، اور میں جھلّا گئی اپنا سا مُنہ لے کر، بس اُسی کا مُنہ دیکھتی رہ گئی۔ پھر کچھ دیر بعد اُس کا مذہب ٹٹولنے کی کوشش کرنے لگی۔ دِن کے نو بج چکے تھے، اور دہرہ دون تقریباً بیس کلومیٹر رہ گیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی، ’’اُس کو بھی شاید دہرہ دون ہی جانا ہے، ورنہ بیچ میں ہی اُتر جاتا۔ کچھ دیر بعد دہرودون آجائے گا، اور یہ اپنا راستہ لے گا، کیوں نہ اُس کا مذہب دریافت کر لیا جائے۔‘‘ اور پھر میں نے پوچھا بھی۔ ’’میں ہر مذہب کو مانتا ہوں۔‘‘ اُس نے بتایا۔

’’بتادیتا تو کیا...؟ ممکن ہے میرا ہم مذہب ہوتا، تو میں اس سے شادی کر کے اپنی لاکھوں کی جائداد کا حقدار بنادیتی اُس کو۔‘‘

ہے بڑا کمینہ، دیکھونا...؟ پنڈت جی اور مولانا صاحب سے بھڑ گیا، پوچھتا ہے، ’’چانداور سورج کا مذہب بتاؤ...؟ اندھیرا اور اُجالا کس مذہب کے ہیں...؟ رات اور دن کا کس مذہب سے تعلق ہے...؟ پیڑ اور پودوں کا مذہب بتاؤ؟ خود کو جلا کر دوسروں کو اُجالا دینے والی شمع کا کیا مذہب ہے...؟ پرندوں سے پوچھو کہ کس مذہب کے ہیں وہ...؟ تمہارا خون تم کو تمہارا مذہب بتا سکتا ہے کیا..؟ اگر نہیں، تو اپنا الگ مذہب بنانے کا کیا حق ہے تم کو...؟ بولو...! جواب دو...؟‘‘

ہُنہ...؟ بڑا آیا۔ کہتا ہے، ’’میں ہر مذہب کو مانتا ہوں۔‘‘ ایسوں کو تو میں خوب سمجھتی ہوں۔ مُنہ میں رام بغل میں چُھری۔ زبان پر کچھ اور دِل میں کچھ اور۔ کسی الکشن میں کھڑے ہونے کی فیلڈ بنا رہا ہوگا۔ مجھے تو یہ رنگا سیار لگ رہا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ کٹّر مذہبی ہوگا، اِلکشن جیتنے کے بعد اپنے رنگ دکھائے گا۔ بڑا فریبی نکلے گا یہ۔ دیکھونا...؟ کیسا کہہ رہا ہے، ’’میرا ہر مذہب سے واسطہ ہے، ہر مذہب کے لوگوں سے مجھ کو ہمدردی ہے۔ ہر مذہب کا خون میرا خون ہے۔‘‘ کیسی قابلیت بگھار رہا ہے۔ پنڈت جی اور مولانا صاحب کی بولتی بند کردی ہے اِس نے۔ میرے مُنہ لگتا، تو میں اِس کا پتہ پھاڑ دیتی۔ میں اُس کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ بس رُک گئی۔ ایک طرف ایک بس کھڈ میں گِر کر چور چور ہوگئی تھی۔ لاتعداد زخمی مسافر اِدھر اُدھر تڑپ رہے تھے۔ بہت سے مسافر اُتر کر اُس بس کے قریب پہنچ گئے۔ میں بھی اپنی سیٹ سے اُچھل کر اُس کے ہم راہ اُن زخمی مسافروں کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ بڑی ہمدردی سے زخمیوں کی خدمت کر رہا ہے۔ مرنے والوں پر آنسو بہا رہا ہے۔ جب کوئی زخمی درد سے چیختا، تو لگتا کہ جیسے اُس کے ہی درد ہوا ہو۔ کچھ دیر بعد بس سے اُترے ہوئے مسافر پھر بس میں پہنچ گئے، لیکن وہ بدستور زخمیوں کی سیوا کرتا رہا۔ جانے والی بس نے کئی ہارن دیے، لیکن اُس نے بس کو جانے کا اشارہ کر دیا۔ ’’آپ کو تو سی۔ بی۔ آئی۔ کے انٹرویو میں جانا ہے..؟‘‘ میں نے اُس کو یاد دلایا۔

’’اُس سے ضروری یہ ہے۔ کسی ایک کی جان بچالینا زندگی کی سب سے بڑی کمائی سمجھوں گا۔‘‘ وہ جواب دے کر پھر زخمیوں کی سیوا میں لگ گیا۔ میں اُس کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھ کو ہر مذہب کا لگ رہا تھا۔ مسلمان کے پاس جاتا تو مسلمان لگتا، ہندو کے پاس جاتا تو ہندو۔ غرض کہ ہر مذہب کے لوگوں میں اُس کو اپنا ہی عکس دکھائی دیتا۔ میں گُم سُم کھڑی اُسے ہی تاکے جا رہی تھی۔ اُس کے کہے ہوئے جملے میرے کانوں میں گونجتے تھے۔ میں نے بریف کیس سے چیک بُک نکالی اور دس ہزار کا چیک زخمیوں کے لیے کاٹ کر اُس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ چیک دیکھنے لگا اور میں زخمیوں کی سیوا میں لگ گئی۔

’’آپ کون ہیں...؟‘‘ اُس نے مجھ سے دریافت کیا۔ ’’انسان‘‘ میں نے اُس کو جواب دیا۔ ’’تمہارا کس مذہب سے تعلق ہے...؟‘‘ اُس نے پھر سوال کیا۔ ’’میں ہر مذہب کی ہوں، میرا ہر مذہب سے واسطہ ہے۔ ہر مذہب کے لوگوں سے مجھ کو ہمدردی ہے۔ ہر مذہب کا خون میرا خون ہے، تمہاری طرح‘‘ میں نے اُس کو بے باکی سے جواب دیا۔ میں نے دیکھا وہ میرے چہرے کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ ○■○

حنیف سید 12/34 سوئی کٹرہ، آگرہ
282003، (یو۔پی)

''انسان'' (افسانہ)

حنیف سیدؔ

دہرہ دون کے سفر میں وہ جوان بھی میرا ہم سفر تھا۔لیکن میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ دہرہ دون جا رہا تھا یا کہیں اور۔بس میں بہت سے مسافر تھے۔میں اس کا ذکر اِس لیے کر رہی ہوں کہ وہ دوسرے مسافروں جیسا نہیں تھا۔سب آرڈنری کلر کے تھے،وہ خوب صورت۔سب دقیانوسی لباسوں میں تھے،وہ اسمارٹ لگ رہا تھا۔سب چپ تھے اور وہ بک بک کیے جا رہا تھا،کبھی پالیٹکس پر گفتگو کرتا،تو کبھی مہنگائی بڑھنے کے وجوہات پر۔کبھی طلبا کی سمسیاؤں پر بحث کرتا،تو کبھی فرقہ وارانہ فساد پر۔غرض کہ کسی نہ کسی ٹاپک پر الجھائے ہوئے تھا۔اُس کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ کسی اعلیٰ خاندان کا ہے۔مجھ کو اُس کی ہر بات سے اتفاق تھا،اور وہ ہر طرح مجھ کو پسند بھی تھا۔اِس کے علاوہ اُس میں دوسروں سے الگ ایک اور بات بھی تھی،جس سے میں احساسِ کمتری کا شکار ہو کر اُس سے حسد کرنے لگی تھی،وہ یہ کہ اُس نے ابھی تک مجھے نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا،حالاں کہ میں خوب صورت تھی اور جاذبِ نظر بھی۔جس کا مجھ کو صرف آج ہی نہیں بہت پہلے بھی احساس ہو چکا تھا۔جب شریفوں جیسے لوگ مجھے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے،اِس بس میں بھی بہت سے لوگ جو شکل وصورت اور لباس سے شریفوں جیسے کہلانے کے مستحق تھے،مجھ کو بہک جانے والی نظروں سے دیکھ کر نظریں چُرا رہے تھے لیکن اُس نے میری طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا،میرا دعویٰ تھا کہ وہ میری جانب ایک نظر دیکھے بھی تو سہی،تو میں اس کے غرور کی دھجیاں اُڑا دوں،لیکن مجھ سے نظر ملائے بھی تو کمبخت۔میری جانب نہ دیکھنے کے باعث مجھ کو اُس سے نفرت ہونے لگی تھی،لیکن دِل اُس کی ہر بات اور خیالات پر نثار ہو جانے کے لیے بے قرار تھا۔میں اُس کے خیال میں غرق ہوتی چلی جا رہی تھی،جس کا احساس مجھ کو اُس وقت ہوا،جب اُس نے نظر جھکائے ہوئے مجھ سے کہا؛''محترمہ......!آپ کی سلیپر نے میرے جوتے کا ستیاناس کر ڈالا۔''اور میں جھجک کر ہوش میں آتے ہوئے اُس کے بارے میں سوچنے لگی۔''کمبخت....!مجھ سے مخاطب بھی ہوا تو نظر جھکا کر،بالکل بے نیازی سے۔میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ دیتا تو کیا بگڑ جاتا اُس کا۔بڑا آیا،مغرور کہیں کا۔بڑے فریبی ہوتے ہیں یہ مرد۔اِسی طرح سیدھے،اور شریف بن کر،سیدھی اور بھولی لڑکیوں پر جال پھینک کر پھانس لیتے ہیں،پھر اپنے رنگ دکھاتے ہیں۔دیکھونا....!کیسی شیریں زبان میں اپنے خاندان کی تعریف کر رہا ہے۔کہتا ہے؛''میرا بھائی فلاں ہے،میرے چچا فلاں تھے میرے ماما ڈی ایم ہیں..ہُنہ...!ڈی ایم کیا...؟ پیون بھی نہ ہوں گے۔'' سب ہیں تو ہیں،تم کیا ہو.....؟ چلے نکھٹّو قابلیت جھاڑنے،دکھا رہے ہیں انٹرویو لیٹر،کہہ رہے ہیں؛ ''سی بی آئی کے انٹرویو میں جا رہا ہوں۔''

ارے...!یہ تو سی بی آئی کے انٹرویو میں جا رہا ہے۔اِس میں اتنی قابلیت ہوگی تب ہی تو انٹرویو میں کال کیا گیا ہے،لیکن میری طرف کیوں نہیں دیکھتا...؟ میں بھی جوان ہوں اور وہ بھی۔سوچتا ہوگا''پہلے وہ دیکھے،پھر دیکھوں گا،پہلے وہ بولے پھر بولوں گا۔''نہیں نہیں...ایسی کوئی بات نہیں۔اگر دیکھنے کی بات ہوتی تو میری نظر تو اُسی پر جمی ہے،پھر کیا ہے....؟ شاید اُس کی شادی ہوگئی ہوگی۔اُس کی بیوی بھی خوب صورت ہوگی،جس کو وہ بہت چاہتا ہوگا۔ایسی بھی کوئی بات نہیں،اب دیکھونا...! کتنے لوگ بیٹھے ہیں،بہت سے لوگوں کی شادیاں بھی ہو چکی ہوں گی اور اُن کی بیویاں بھی خوب صورت ہوں گی تو یہ لوگ کیوں مجھ کو تاک رہے ہیں۔ارے ہاں...!ابھی پاس والے نے شادی کے بارے میں دریافت کیا تھا اُس سے،تو اُس نے بتایا تھا''شادی کا ابھی کوئی ارادہ نہیں۔''نہ ہوا ارادہ،میں کب کرتی ہوں اُس سے شادی...! کیا پتا،کس کاسٹ کا ہو...؟ میں ایرا غیرا نتھو خیرا سے تو کر نہیں لونگی شادی،میں تو اپنی ہی کاسٹ میں کرونگی،میری کاسٹ میں کیا ہیں نہیں لڑکے...؟ بہت ہیں خوبصورت خوبصورت۔رہی قابلیت،تو کیا بیاہی ہے کسی کو...؟ جو چاہے محنت سے حاصل کر سکتا...محنت سے۔میں تو خوب پڑھے لکھے،اسمارٹ اور اپنی ہی کاسٹ کے لڑکے سے کروں گی شادی۔ہو سکتا ہے،یہ بھی میری ہی کاسٹ کا ہو۔لڑکا ہے بہت ٹھیک،بہت کم ملتے ہیں ایسے لڑکے۔

ترمیم کا اختیار بھی پارلیامنٹ کے سپرد کردیا۔ ان کے سماجی فلسفے کا انحصار آزادی، مساوات اور اخوت کے اصولوں پر مبنی تھا۔ دراصل وہ ایک ایسے سماج کے حامی تھے جس میں نہ اونچ نیچ ہو اور نہ ہی چھوت چھات۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اس نئے سماج کو بنانے اور سنوارنے میں وقف کردی۔

پست اور خستہ حال طبقات کی فلاح و بہبود کے لیے ان کی طویل جدّ و جہد کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ صدیوں سے ظلم وستم کا شکار ہو رہے لوگوں کو انھوں نے پسماندگی اور ذلت کے دلدل سے نکال کر سماج میں برابری کا مقام دلایا۔ دراصل مجبوروں اور بے کسوں کو سماج میں مساوی درجہ دلانا، ان میں خود اعتمادی اور بیداری کا جذبہ پیدا کرنا ہی ڈاکٹر امبیڈکر کی زندگی کا نصب العین رہا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب و کامران رہے۔

۱۴/اکتوبر ۱۹۵۶ء کو ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنے ماننے والوں کے ہمراہ ناگ پور میں بودھ دھرم اختیار کرلیا تھا۔ حالانکہ وہ ایک طویل عرصہ سے بودھ مذہب کا مطالعہ کرتے آرہے تھے۔ ہمارے قومی پرچم پر چکر کا نشان، ہندوستانی کرنسی پر سمراٹ اشوک کی لاٹ کا نقش، ہمارے صدر جمہوریہ کی سرکاری کرسی پر چکر کا نشان بابا صاحب امبیڈکر ہی کی جدّ و جہد کا نتیجہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ گوتم بدھ نے جس ملک میں اخوت، انسانیت، امن اور رواداری کی تبلیغ کی اسی ملک کے لوگوں نے ان کے مذہب کو فراموش کردیا۔

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی زندگی کے چار اہم واقعات مہاڑ (ضلع قلابہ، مہاراشٹر) میں چودار تالاب ستیہ گرہ، مہاڑ ہی میں منو اسمرتی جلانے کا واقعہ، ناسِک کے کالا رام مندر میں داخلہ ستیہ گرہ اور ناگپور میں بودھ دھرم کی دیکشا، ان کی حوصلہ مندی اور تبدیلیِ مذہب کے اقدام کی روشن مثالیں ہیں۔

ترسٹھ سال سات ماہ اور بائیس دن اس دنیا میں زندگی بسر کرنے والے ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے ملک میں عدل وانصاف، مساوات اور جمہوری اقدار کی جو شمع روشن کی وہ ہم سب کو روشنی دیتی رہے گی۔

○■○

نثار اختر انصاری (ایڈیٹر ''ہمہ گیر'')
مومن پورہ، چوک، ناگپور، 440018

فی شمارہ -/20 روپیہ | سالانہ -/100 روپیہ | پانچ سال کے لیے -/400 روپیہ
ترسیل زر کا پتہ : سکریٹری نئی دلی میونسپل کونسل پالیکا کیندر پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دلی۔ ۱۱۰۰۰۱
خط وکتابت کا پتہ: ایڈیٹر پالیکا سماچار اردو شعبۂ اردو کمرہ ۱۲۰۹ پالیکا کیندر پارلیمنٹ اسٹریٹ نئی دلی۔ ۱۱۰۰۰۱
فون نمبر 70/3209 to 41501354

نثار اختر انصاری

سماجی انصاف کے علمبردار

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کا نظریہ تھا کہ سماجی انصاف اس وقت ممکن ہے، جب سماج میں ناانصافی کا نام ونشان نہ ہو۔ ملک میں سماجی، معاشی اور تعلیمی نابرابری کو ختم کرنے اور ہر ہندوستانی کو ہر محاذ پر یکساں مواقع فراہم کرنے کے لیے انھوں نے سخت جدّ وجہد کی۔

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ملک کی آزادی کے بعد آئین سازی کے بنیادی ڈھانچے کی تشکیل کا کام، مسودہ کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ جس کا صدر ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کو بنایا گیا۔ انھوں نے مسوّدہ کمیٹی کے دیگر اراکین کے ساتھ ۲۹/اگست ۱۹۴۷ء سے ۲۵/نومبر ۱۹۴۹ء تک جس جانفشانی سے آئین کا مسوّدہ تیار کیا اس کے لیے انھیں چاروں طرف سے مبارکباد ملی۔

۲۶/نومبر ۱۹۴۹ء کو آئین ساز اسمبلی نے اس آئین کو اپنی منظوری دے دی اور ۲۶/جنوری ۱۹۵۰ء سے اس آئین کا نفاذ عمل میں آیا۔ انھوں نے دبے کچلے پسماندہ طبقوں کو پارلیامنٹ، صوبائی اسمبلیوں، سرکاری ملازمتوں اور دوسرے شعبوں میں ریزرویشن دلوایا۔ کیوں کہ یہ طبقات طویل مدت سے سماجی انصاف و دیگر سہولتوں سے محروم تھے۔ خوشحالی اور ترقی کے دروازے ان پر بند تھے۔ دستورِ ہند کے معمار ڈاکٹر امبیڈکر نے پارلیامنٹ میں جمہوری ہند کا آئین پیش کرتے ہوئے کہا تھا؛

> ''ہماری جمہوریت کی بنیاد آزادی، برابری اور انصاف پر رکھی گئی ہے۔ ہم اس ملک میں جمہوری نظام قائم کر رہے ہیں لیکن اگر ہندوستانی آئین کو عملی شکل دینے والے لوگ اچھے نہیں ہوں گے تو عام لوگوں کو سماجی انصاف نہیں مل سکے گا۔ جمہوری نظام کے اول معنی ہیں اونچ نیچ، فرقہ پرستی اور سماجی برائیوں سے پاک نظام کی تشکیل۔''

بابا صاحب امبیڈکر ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ حقوق اور وسائل سے محروم لوگوں کو ترقی کرنے کا پورا پورا موقع ملے۔ ہندوستان میں جمہوری نظام نافذ ہونے سے انھیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ہر بالغ اپنی مرضی سے ووٹ دے گا اور جن راجہ مہاراجہ، نواب اور زمینداروں کی حویلی تک پسماندہ اور غریبوں کی رسائی ناممکن تھی اب وہی رئیس اور راجہ ووٹ حاصل کرنے کے لیے غریب کی کٹیا کے چکر لگائیں گے۔

دستورِ ہند کا مسودہ تیار کرتے وقت ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے دنیا کے کئی جمہوری ممالک کے آئین کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ زندگی کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں، حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ اس لیے انھوں نے آرٹیکل ۳۶۸ کے تحت آئین میں

نئی دلّی میونسپل کونسل

NDMC
पालिका समाचार

نئی دہلی پالیکا سماچار

☆ جلد......۳۷ ☆ شمارہ......۵-۶ ☆ دو ماہی ☆ مئی - جون ۲۰۱۴ء

اس شمارہ میں

☆ اداریہ ☆

اداریہ:			
تعارف:			۲
شخصیات وادبیات:	سماجی انصاف کے علمبردار "ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر" اردو میں خطوط نگاری کی روایت	نثار اختر انصاری ابو ہریرہ خاں، ریسرچ اسکالر	۳ ۱۵
انشائیے	"مولانا راکٹ"	مختار ٹونکی	۱۱
کہانیاں/افسانے	"انسان" "سسکتے ارماں" افسانچے ("تلاش"، "ردِ عمل")	حنیف سید شائستہ نصیر بسم اللہ عدیم	۵ ۸ ۱۴
خطوط	"آپ کے خطوط"	ادارہ	۲۰
خبرنامہ:		ادارہ	۲۱ تا ۲۴

❖ غزلیات ❖

ڈاکٹر ایم آئی ساجد............۷

ڈاکٹر ذکی طارق............۷

خان عطیق آفریدی............۱۰

ظفر علی ظفر............۱۰

مدہوش بلگرامی............۱۹

ڈاکٹر شفیق اعظمی............(نظم، "ہند کو جنت بنائیں دوستوں")............۱۳

"تحریروں میں اظہارِ خیال مصنفین کے اپنے ہیں۔ اِس سے ادارتی بورڈ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ مدیر کو اِن تحریروں میں اصلاح اور قطع و برید کا پورا حق ہے۔ اِن خیالات پر کسی طرح کے اعتراضات کا حق مصنفوں کا ہی ہے اور کسی بھی تنازعہ کا قانونی چارہ جوئی دلّی کی عدالت میں ہوگی۔" (مدیر)

پالیکا سماچار

نئی دلّی میونسپل کونسل

☆ ادارتی بورڈ ☆

جلد ۳۷۔ دوماہی۔ شمارہ۔ ۵-۶ مئی/جون ۲۰۱۴ء

سرپرست

جلج شریواستو

☆☆

چیف ایڈیٹر

وکاس آنند

☆☆

ڈپٹی چیف ایڈیٹر

راکیش کمار گوڑ

☆☆

انیتا جوشی

ایڈیٹر و ناشر

☆☆

تعاون

انیس فاطمہ

سنیتا بوہادیہ

آصف علی

☆☆☆

فی شمارہ -/20 روپیہ

سالانہ -/100 روپیہ

پانچ سال کے لیے -/400 روپیہ

ترسیل زر کا پتہ: سکریٹری نئی دلی میونسپل کونسل پالیکا کیندر

پارلیمنٹ اسٹریٹ نئی دلی۔ ۱۱۰۰۰۱

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر پالیکا سماچار اردو شعبۂ اردو کمرہ ۱۲۰۹

پالیکا کیندر پارلیمنٹ اسٹریٹ نئی دلی۔ ۱۱۰۰۰۱

فون نمبر: 41501354 to 70/3209

اداریہ

(مدیر کے قلم سے)　　　　مئی۔ جون ۲۰۱۴ء

محنت کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔ اگر ہم کوئی بھی کام مثبت سوچ و محنت کے ساتھ کرتے ہیں تو یقیناً کامیابی ملتی ہے۔ محنت کامیاب ہونے کا آلہ ہی نہیں بنیادی عنصر بھی ہے۔ کسی بھی تنظیم کی ترقی کی بنیاد اُس میں کام کرنے والے مزدور و عقیدت مند ملازم ہی ہوتے ہیں۔ مزدور طبقہ کی محنت کے ساتھ ساتھ ملازم طبقہ کی خود اعتمادی، مضبوط ارادہ اور مثبت خیال کے بدولت ہی کوئی تنظیم/ادارہ خوشحال و دولت مند ہوتا ہے۔ اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے یکم مئی ۲۰۱۴ء کو آقا (مالک) و مزدور اور افسر و ملازم وغیرہ اس جشن کو یومِ مئی کے طور پر مناتے ہیں۔ اس دن وہ تبادلۂ خیال کے ذریعے اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں بلکہ اس سے دونوں طبقوں کے درمیان ایک صحت مند ماحول وجود پاتا ہے جس سے دونوں کے درمیان کی دوریاں کم ہوتی ہیں۔ نئی دہلی میونسپل کونسل کے افسروں و ملازموں نے جذبۂ ایثار کے ساتھ اعلیٰ درجے کی کارکردگی پیش کر کے ایک مثال قائم کیا ہے جو آئندہ بھی جاری رہے گا۔

ہر سال ۵/جون پوری دنیا میں یومِ ماحولیات کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس دن کو منانے کا اہم مقصد یہ ہے کہ عوام ماحولیات کی اہمیت کو سمجھیں اور ماحول کو آلودہ ہونے سے بچائیں۔ بڑھتی آبادی، غریبی، صنعت کاری اور جنگلوں کی کٹائی ماحولیات کو بگاڑنے کی اہم وجہ ہیں۔ ماحولیات کے بگڑتے حالات سے سبھی واقف ہیں اور دنیا کے تمام ممالک اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے کوشاں ہیں۔ فضائی توازن کو بنائے رکھنے کے لیے ہم سبھی کو مل کر ''فطرت کی طرف واپس چل'' اصول کی تعمیل کرنا چاہیے۔ آج وقت آ گیا ہے جب ماحولیات اور ترقی میں مناسب تال میل بنا کر ہر ممکن کوشش کی جائے جس سے ترقی کی دوڑ میں فطرت پر آنچ نہ آئے۔ اس لیے ماحولیات سے متعلق الحاقی مسئلے کے نمٹارے کے لیے متحدہ کوشش کی اہم ضرورت ہے تاکہ فطرت، انسانیت اور تہذیب کو محفوظ کیا جا سکے۔

مئی/جون ۲۰۱۳ء سے نئی دہلی ''پالیکا سماچار'' نئے رنگ و روپ میں شائع ہو رہی ہے۔ اس دوران مصنفوں/قاریوں کے تعاون کے لیے ہم ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی آپ اپنے قیمتی خیالات و آراء سے ہمیں آگاہ کراتے رہیں گے۔

وکاس آنند
چیف ایڈیٹر

"پالیکا سماچار اردو نئی دھلی"، میونسپل کونسل کے لیے انیتا جوشی نے شائع کیا اور نوتن پرنٹرس

F/89/12 اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیس 1، نئی دہلی 110020، Tel.: 26817055